منشی پریم چند

شعلۂ حسن
منشی پریم چند
چودھری اکیڈمی
۳۰۵۔ ذوالقرنین چیمبرز۔ گنپت روڈ لاہور

ناشر ——— محمد خالد چوہدری

اہتمام ——— میاں محمد اسلم

مطبع ——— الفرید پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت ——— 30/- روپے صرف

چوہدری اکیڈمی - لاہور

فہرست

دیباچہ

تاریخ ادبیات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ پریم چند ان چند گنے چنے ادیبوں میں ہیں جنہوں نے قصہ گوئی اور ضخیم داستانوں سے ہٹ کر زندگی کی سچائیوں اور حقیقتوں کو موضوع بنایا۔ تلخ اور شیریں واقعات جن سے عام آدمی متاثر ہوتا ہے۔ مخصوص اور منفرد انداز میں قلم بند کیے ہیں۔ ان کی نثر میں عقلیت۔ مقصدیت۔ استدلال اور سادگی ہے۔ انہوں نے علمی۔ مذہبی۔ معاشرتی۔ سیاسی اور سماجی موضوعات پر بہت کچھ لکھا۔ مقصدیت کی وجہ سے اسلوب اور زینت الفاظ پر کم توجہ صرف کی۔ تاہم ان کی تحریروں میں روانی سادگی۔ سچائی اور خلوص ہے۔ پریم چند نے اردو افسانے کی داغ بیل ڈالی اور اسے بام عروج تک پہنچایا۔ ان کے افسانوں کے پلاٹ سوچے سمجھے ہوتے ہیں۔ فنی اور واقعاتی ربط اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ مقصدیت کا دامن کبھی تار تار نہیں ہوتا۔ جملے چھوٹے اور بامعنی ہوتے ہیں۔ ان کی بندش نہایت جامع دلکش اور جاذب ہوتی ہے۔ استعارات۔ تشبیہات اور تلمیحات کا بہت کم استعمال کیا گیا ہے۔ ان کی تحریروں میں معاشرہ۔ فرد۔ سماج۔ قوم اور ملک کی اصلاح کا پہلو نکلتا ہے۔ افسانوں میں کہیں جھول نظر نہیں آتا۔ میانہ روی اور دلچسپ زبان و بیان سے ان کو سادہ اور عام فہم بنایا کہ ہر کس و ناکس استفادہ کر سکتا ہے۔ افسانوں کا طرز بیان بالکل اچھوتا ہے

جدت اور ندرت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ہر افسانے میں نئی بات نئے ڈھنگ سے کی گئی ہے کہ ان کو دیکھ کر خاص قسم کی راحت اور خوشی محسوس ہوتی ہے۔ حقائق اور واقعات اس چابک دستی سے بیان کیے گئے ہیں کہ ہزل اور فحش کا شائبہ ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ ان میں نکھار اور پاکیزگی ہے خیالات۔ جذبات۔ تجربات اور مشاہدات سلیقے سے پیش کرتے ہیں کہ قاری لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ روزمرہ کے بول چال میں دقیق اور پیچیدہ مسائل، شستہ اور رفتہ زبان میں بیان کیے ہیں کہ معمولی قابلیت کا آدمی بھی استفادہ کر سکتا ہے۔

منشی پریم چند چھوٹے چھوٹے قصّے لکھنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں کیونکہ آپ کے افسانوں کا اس زمانے کی نام نہاد قصوں سے دور کا واسطہ نہیں۔ انہوں نے الفاظ کی بندش بیان کی روانی سے چھوٹے بڑے واقعات اور تاثرات اس طرح پیش کیے ہیں کہ نگاہوں کے سامنے واقعات کی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ ان کی تحریر تین خصوصیات کی حامل ہے۔ اول مطالعہ فطرت دوم روزمرہ واقعات کا بیان، سوم اندازِ بیان۔ ان تینوں خصائص کے مجموعے کو پریم چند نے قلم کے جادو سے اتنا زوردار بنایا ہے کہ قاری ان کے ایک ایک لفظ پر مسحور ہو جاتا ہے۔ تن بدن میں اختیار نہیں ہوتا کہ وہ ان افسانوں کے اثر سے متاثر نہ ہو۔ افسانوں میں جزئیات کی اہمیت سے روگردانی نہیں کی گئی۔ تفصیلات اتنی طویل نہیں کہ افسانوں میں واقعات اور مقصدیت کو ہی لے ڈوبیں۔ ان کے ہاں واقعات

کے بغیر افسانہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ افسانہ ہر حال میں افسانہ رہتا ہے۔ انہوں نے افسانے کو کبھی خاکہ نہیں بننے دیا۔ نفسیاتی تجزیوں کی بجائے واقعات اور حقائق کا سہارا لے کر افسانوں کو لافانی اور زندۂ جاوید بنا دیا۔ افسانے اتنے بھرپور ہیں کہ مختلف ادوار گزرنے کے باوجود ان کے افسانوں کی افادیت میں رتی بھر فرق نہیں پڑا اور وہ اب بھی جدیدیت اور ترقی پسندیت کے دور میں بھی ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ اس مجموعے میں پریم چند کے کچھ افسانے پیش کیے جا رہے ہیں۔ قارئین ان سے مفید استفادہ حاصل کر سکیں گے۔

میاں محمدؐ رفیق

شعلۂ حُسن

(۱)

ڈگری لینے کے بعد میں قریب قریب روز پبلک لائبریری جایا کرتا تھا۔ اخباروں اور کتابوں کا مطالعہ کرنے کے لیے نہیں۔ کتابوں کو تو میں نے چھونے کی قسم کھالی تھی جس دن گزٹ میں اپنا نام دیکھا اُسی دن بِل اور کیبنیٹ کے پرُزے پرُزے کر دیئے۔ میں صرف اسٹیٹسمین اور پایونیر کے "وانٹڈ" کالموں کو دیکھا کرتا تھا۔ فکر معاش دامنگیر تھی۔ میرے دادا نے بغاوت کے زمانے میں کسی انگریز افسر کی جان بچائی ہوتی۔ یا قبضہ میں کثیر موروثی جائداد ہوتی تو کسی معزز عہدے کے لیے کوشش کرتا۔ اب میرے لیے بجز زندگی کے دن کاٹنے کے اور کیا تھا؟ معلوم نہیں لیڈر میں ایسے اشتہارات کیوں نہیں

ہوتے۔ اخبار اشتہاروں کی آمدنی پر چلتے ہیں۔ یہاں کی ضرورتیں اسکول ماسٹروں تک ختم ہو جاتی ہیں۔ کیا ہمارے فیشن ایبل ہندوستانیوں کو گھوڑوں اور موٹروں اور کتوں اور زیوروں کی خرید و فروخت کی ضرورت نہیں ہے؟ غالباً یہ لوگ اپنی ضرورتیں انگریزی اخباروں سے پوری کرتے ہوں گے۔ خیر مہینوں اسی طرح دوڑتے گزر گئے۔ اپنے مزاج کے موافق کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ مجھے اکثر اپنے بی۔ اے ہونے پر غصہ آتا تھا۔ کاش ڈرائیور یا فائرمین۔ خانساماں یا باورچی ہوتا تو مجھے اتنا انتظار نہ کرنا پڑتا۔

آخر ایک روز مجھے اپنی مرضی کے موافق ایک "مانگ" نظر آئی کسی رئیس کو ایک پرائیویٹ سکریٹری کی ضرورت تھی۔ جو اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ۔ رنگین طبع۔ خوش مذاق اور وجیہہ ہو۔ تنخواہ ایک ہزار۔ درخواست کے ساتھ فوٹو بھی طلب کیا گیا تھا۔ میں اچھل پڑا۔ کاش تقدیر یاوری کرتی! اور یہ منصب میرے ہاتھ آتا۔ تو زندگی چین سے کٹ جاتی! اسی دن درخواست مع فوٹو روانہ کر دی مگر اپنے احباب سے اس کا ذکر نہ کیا کہ کہیں خفت نہ اٹھانی پڑے۔ دل ہر دم اسی خیال میں ڈوبا رہتا۔ بیٹھے بیٹھے شیخ چلی کے منصوبے باندھا کرتا۔ پھر ہوش میں آکر اپنے تئیں سمجھاتا کہ مجھ میں ایسے جلیل منصب کے لیے کونسی قابلیت ہے؟ میں ابھی کالج کا نکلا ہوا کتابی اصولی انسان ہوں۔ دنیا سے بے خبر۔ اس جگہ کے لیے ایک سے ایک عالم۔ فاضل منہ پھیلائے

بیٹھے ہوں گے۔ میرے لیے کوئی امید نہیں۔ بس خوش رو سہی۔ سجیلا سہی۔ مگر ایسے عہدوں کے لیے محض خوش رو ہونا کافی نہیں ہو سکتا۔ اس کے لکھنے کا منشا صرف اتنا ہوگا کہ سائل کو صرف کمزور نہ ہونا چاہیئے اور یہی معقول بھی ہے بلکہ بہت سجیلا پن تو مناصب گرامی کے لیے کچھ خلاف شان ہے۔ مختصر سا توند۔ بھرا ہوا بدن۔ پھولے ہوئے رخسارے اور تحکمانہ انداز تقریر یہ حکومت اور رعب کے لوازمات ہیں۔ اور مجھے ان میں سے ایک بھی میسّر نہیں۔ میرے لیے کیا اُمید ہو سکتی ہے؟ اسی امید و بیم کی حالت میں ایک ہفتہ گزر گیا اور اب میں بالکل مایوس ہو گیا۔ سوچا میں بھی کیسا احمق ہوں کہ ایسی بے سر پیر کی بات کے پیچھے پھُول اٹھا۔ اسی کو لونڈا پن کہتے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس اشتہار کی کوئی اصلیت نہیں۔ کسی ستم ظریف نے آج کل کے تعلیم یافتہ آدمیوں کی حماقت کا امتحان لینے کے لیے یہ شگوفہ چھوڑا ہے۔ میں بھی کتنا کوتہ اندیش ہوں کہ یہاں تک بھی ممکن نہ پہنچی۔ آٹھویں دن علی الصبح تار کے چپڑاسی نے مجھے آواز دی۔ میرے کلیجہ میں گدگدی سی ہونے لگی۔ لپکا ہوا آیا۔ تار کھول کر دیکھا۔ لکھا تھا ”منظور ہے۔ فوراً آؤ۔ عیش گڑھ“۔ مگر اس تار کے ملنے سے مجھے وہ خوشی نہ ہوئی جس کی امید تھی۔ میں اُسے لیے کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ اعتبار نہ آتا تھا۔ ضرور کسی ستم ظریف کی شرارت ہے مگر خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ مجھے بھی اس کا دندان شکن جواب دینا چاہیئے کیوں

نہ تار دیدوں ایک ماہ کی تنخواہ پیشگی بھیج دو۔ آپ ساری کیفیت کھل جائے گی لیکن پھر سوچا کہیں فی الواقع طالع خفتہ بیدار ہوا ہو تو اس قسم کی حماقت سے بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ چلو دل لگی سہی۔ زندگی میں یہ واقعہ بھی یاد رہے گا۔ اس طلسم کو کھول ہی ڈالوں۔ فوراً تار سے اپنی روانگی کی تاریخ کی اطلاع دی اور سیدھا ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ یہ مقام دکن کی طرف ہے۔ ٹائم ٹیبل میں اس کا ذکر مفصل لکھا تھا۔ مقام بہت خوش منظر سیر کے قابل ہے۔ آب وہوا بہت اچھی نہیں مگر مضبوط جسم کے نوجوانوں پر اس کا اثر دیر میں نظر آتا ہے وادیاں تاریک ہیں۔ ان میں گھسنا خطرناک ہے۔ کیونکہ زہریلے جانور بہت چھپے رہتے ہیں۔ غرض حالات کافی طور پر اشتیاق انگیز تھے۔ آکر مختصر سامان سفر درست کیا اور خدا کا نام لے کر چل کھڑا ہوا۔ اپنے عزیزوں اور دوستوں سے اس کا مطلق ذکر نہ کیا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ دو چار دن میں اپنا سا منہ لیے لوٹوں گا۔ اس وقت شماتت ہمسایہ کا خوف نہ ہوگا

(۲)

گاڑی پر بیٹھا تو شام ہو گئی تھی۔ کچھ دیر تک تو سگار اور اخبار سے دل بہلاتا رہا۔ پھر معلوم نہیں کب نیند آگئی۔ آنکھ کھلی اور کھڑکی سے باہر کی طرف جھانکا تو صبح کا دل فریب نظارہ دکھائی دیا۔ دونوں طرف سبزہ سے ڈھکے ہوئے کہسار تھے۔ ان پر چرتی ہوئی اُجلی اُجلی گائیں اور بھیڑ بکریاں آفتاب کی سنہری شعاعوں میں رنگی ہوئی ایسی معلوم

ہوتی تھیں ۔ جیسے ندی میں چمکتے ہوئے تارے ۔ جی چاہتا تھا ۔ کاش میرا آشیانہ بھی انہیں پہاڑیوں میں ہوتا ! جنگل کے پھل کھاتا ۔ جھرنوں کا خوشگوار پانی پیتا اور قدرت کے گیت گاتا ۔ دفعتہً منظر بدلا ۔ ایک وسیع جھیل پہاڑوں کے دامن میں نظر آئی ۔ کہیں مرغابیاں تیرتی تھیں ۔ کہیں چھوٹی چھوٹی ڈونگیاں ۔ ارادہ کمزور کی طرح ڈگمگاتی ہوئی چلی جاتی تھیں ۔ یہ منظر بھی بدلا ۔ پہاڑیوں کی گود میں ایک آباد گلزار گاؤں نظر آیا ۔ جھاڑیوں اور درختوں سے ڈھکا ہوا جیسے طائر دل نے درختوں پر عافیت کے آشیانے بنائے ہوں ۔ کہیں بچے کھیلتے تھے ۔ کہیں گائے کے بچھڑے کلیلیں کرتے تھے ۔ پھر ایک گھنا جنگل ملا ۔ غول کے غول ہرن نظر آئے جو گاڑی کی آواز سنتے ہی چوکڑیاں بھرتے دور بھاگتے تھے ۔ یہ سب مناظر خواب کی تصویروں کی طرح نظر آتے تھے اور آنکھوں سے چھپ جاتے تھے ان میں ایک ناقابل بیان شاعرانہ دلاویزی تھی ۔ جو دل میں حسرت اور شوق کا جادو پھونکتی تھی ۔

آخر عباس گڑھ قریب آیا ۔ میں نے بستر سنبھالا ۔ ذرا دیر میں اسٹیشن کا سگنل دکھائی دیا ۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ۔ گاڑی رکی ۔ میں نے ادھر ادھر قلیوں کی تلاش میں نظر دوڑائی ۔ کہ دو وردی پوش آدمیوں نے آکر مجھ سے پوچھا ۔ آپ ہی ..... سے تشریف لا رہے ہیں ؟ چلیئے موٹر حاضر ہے ۔ میری باچھیں کھل گئیں تحکمانہ انداز سے موٹر پر جا بیٹھا دل میں نادم تھا کہ اسباب اور لباس اس سے بہتر کیوں نہ ہوئے ۔ اگر

جانتا کہ ستارہ سچ مچ چمکا ہے تو ہرگز اس پریشان حالی سے نہ آتا۔ موٹر چلا۔ دورویہ مولسریوں کے سایہ دار درخت تھے۔ سڑک پر سرخی بچھی ہوئی تھی۔ دونوں طرف سبزہ زار تھا۔ سڑک کمان کی طرح خم کھاتی۔ اس میدان سے نکل گئی تھی۔ دفعتہً سامنے ایک پُر فضا ساگر دکھائی دیا۔ اور ساگر کے اُس پار پہاڑیوں پر ایک عالی شان محل تھا جس کا تشکوہ درخشاں پرستان کی یاد دلاتا تھا۔ محل حرص رفعت کی طرح غرور سے سر اٹھائے ہوئے۔ جھیل گوشۂ قناعت کی طرح مبنی اور پرسکون سارا منظر نغمہ اور حسن اور شعر کا مسکن معلوم ہوتا تھا۔

ہم صدر دروازہ پر پہنچے۔ کئی خدمت گاروں نے آکر ہمارا خیر مقدم کیا۔ ان کے ساتھ ایک منشی جی آنکھوں میں سرمہ لگائے کاکلیں سنوارے نظر آئے جو مجھ سے بڑے تپاک سے ملے۔ میرے لیے ایک کمرہ پہلے ہی سے آراستہ تھا۔ منشی جی نے مجھے اس کمرہ کے دروازہ پر پہنچا دیا۔ اور بولے۔ سرکار نے فرمایا ہے۔ اس وقت آپ آرام فرمائیں تکلیف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ شام کو تشریف لائیے گا۔

مجھے اب تک خبر نہ تھی کہ سرکار کون ہیں۔ نہ کسی سے پوچھنے کی جرأت ہوئی۔ اپنے آقا کے نام تک سے بے خبر رہنے کا الزام نہیں لینا چاہتا تھا مگر چاہے کوئی ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ شخص شرافت کا تپلا ہے۔ مجھے اتنی خاطر مدارات کی ہرگز امید نہ تھی۔ اپنے کمرہ میں آرام کرسی پر لیٹا تو مسرت سے میری آنکھیں لبریز ہو گئیں۔ سامنے جھجّا

تھا۔ نیچے جھیل تھی۔ سانپ کے کینچل کی طرح سیاہ و سفید۔ اور میں جیسے
تقدیر نے ہمیشہ اپنا سوتیلا لڑکا سمجھا تھا۔ اس وقت زندگی میں پہلی بار
خالص مسرت کا لطف اٹھا رہا تھا۔ وائے بے خبری۔

سہ پہر کو سرمہ باز منشی جی نے آکر اطلاع دی کہ سرکار نے یاد
فرمایا ہے۔ میں نے اس اثناء میں خط صاف کر لیے تھے۔ پھر اپنا
بہترین سوٹ پہنا اور سرکار کی خدمت میں چلا۔ اس وقت دل
میں ایک قسم کی کمزوری سی محسوس ہوتی تھی لیکن میں اپنی قابلیت
کا بہترین اظہار کرنے کے لیے تیار تھا۔ ہم کئی برآمدوں سے ہوتے
ہوئے آخرکار سرکار کے دروازے پر پہنچے۔ ایک ریشمی پردہ پڑا ہوا تھا۔
منشی جی نے پردہ اٹھا کر مجھے اشارہ سے بلایا۔ میں اندر داخل ہوا اور
حیرت سے ششدر رہ گیا۔ میرے سامنے حسن کا ایک شعلہ دہک
رہا تھا۔

(۳)

پھول میں بھی حسن ہے۔ شعلہ میں بھی حسن ہے۔ پھول میں طراوت
اور تازگی ہے۔ شعلہ میں سوز اور تپش۔ پھول پر بھونرا اڑ اڑ کر
اس کا رس لیتا ہے۔ شعلہ پر پروانہ جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ میرے
سامنے اس وقت زرنگار مسند پر جو نازنین شان سے بیٹھی ہوئی تھی۔
وہ فی الواقع حسن کا شعلہ تھی۔ اس کی مخمور آنکھوں سے جانسوز حرارت
کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ پھول کی پنکھڑیاں ہو سکتی ہیں۔ شعلہ کو بکھیرنا

ممکن نہیں۔ اس کے ایک ایک عضو کی تعریف کرنا شعلہ کو کاٹنا ہے اس کا سر تا پا ایک شعلہ تھا۔ وہی دمک۔ وہی سُرخی۔ کوئی مصوّر سطوتِ حُسن کی اس سے بہتر تصویر خیال میں نہیں لا سکتا۔

اس نے میری طرف مربیانہ انداز سے دیکھ کر کہا۔ آپ کو دوران سفر میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟

میں نے اپنے تئیں سنبھال کر جواب دیا۔ جی نہیں کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی۔

نازنین۔ یہ مقام پسند آیا؟

میں نے دلیرانہ سرگرمی سے جواب دیا۔ اس سے زیادہ دل کش مقام روئے زمین پر نہ ہو گا۔ ہاں گائڈ بک سے معلوم ہوا کہ یہاں کی آب و ہوا بظاہر جتنی خوشگوار ہے فی الواقع ایسی نہیں۔ کچھ خطرناک جانوروں کی بھی شکایت تھی۔

نازنین کا چہرہ زرد ہو گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے جسم میں رعشہ آ گیا۔ مگر دم زدن میں اس کے چہرہ پر پھر اسی غرور و متانت کا جلوہ نظر آیا۔ بولی۔ یہ مقام اپنی خوبیوں کے باعث اکثر حاسدوں کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ بہتر کے حاسد بہت ہوتے ہیں اور بالفرض آب و ہوا میں کچھ نقص ہو بھی تو ماشاء اللہ ابھی آپ کا عالم شباب ہے۔ آپ کو اس کا کیا غم ہو سکتا ہے۔ رہے زہریلے جانور۔ وہ آپ کی نظروں کے سامنے موجود ہیں۔ اگر مور اور ہرن اور ہنس زہریلے جانور ہیں۔ تو

بے شک یہاں زہریلے جانوروں کی کثرت ہے۔

یہ کہہ کر اس نے میری طرف مستانہ نگاہوں سے دیکھا۔

میں نے جوش کے ساتھ جواب دیا۔ ان گامڈ بکوں پر اعتبار کرنا سراسر جہل اور حماقت ہے۔

اس جملے سے نازنین کے دل پر کوئی خاص اثر ہوا۔ بولی آپ صاف گو معلوم ہوتے ہیں۔ اور یہ انسان میں ایک جوہر ہے۔ میں آپ کی تصویر دیکھتے ہی اتنا سمجھ گئی تھی۔ آپ کو سن کر تعجب ہو گا۔ کہ میرے پاس ایک لاکھ سے زائد درخواستیں آئی تھیں کتنے ہی ایم۔ اے تھے۔ کوئی ڈی۔ ایس۔ سی تھا۔ کوئی انگلستان سے پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری پا چکا تھا۔ گویا یہاں مجھے کسی ریاضی یا عملی مسئلہ کی تحقیقات مدنظر نہ تھی۔ کئی بزرگوں نے اپنی کبر سنی کی بنا پر درخواست کی تھی۔ جن کی دوا دارو کے لیے مجھے حکیموں کی ضرورت ہوتی۔ سب سے زیادہ درخواستیں انہیں لوگوں کی تھیں۔ جو کتاب کے کیڑے ہوتے ہیں۔ اور آداب و اخلاق کے سراپا کرتے ہیں۔ ان کی دانست میں اس ملک میں سب سے زیادہ ضرورت عابدوں اور مولویوں کی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انہیں حضرات نے اس ملک کا ستیاناس کیا ہے اخلاقی تعلیم کا اب زمانہ نہیں رہا۔ روایات قدیم قصہ کہانیوں کے لیے مخصوص ہیں۔ یہ زمانہ مادیت اور مادی تعلیم کا ہے۔ جب کہ لوگ سامان عیش پر اپنے تئیں قربان کر دیتے ہیں۔ میں نے وہ سب درخواستیں ردی کی ٹوکری میں ڈال دیں جو کہنی ہوں۔ سینکڑوں درخواستیں انہیں اخلاقی رفارمروں کی تھیں۔ وہ اپنی تصانیف کو سند کے طور پر پیش کرتے تھے۔ صورتیں ایک سے ایک قابل دید! جنہیں دیکھ کر

گھنٹوں ہنسے۔ میں نے انہیں ایک البم میں لگادیا ہے۔ اور فرصت کے وقت جب ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔ تو انہیں دیکھا کرتی ہوں۔ وہ علم اور کمال جو چہرہ کو بگاڑ دے۔ اور انسان سے بن مانس بنادے، مرض ہے۔ آپ کی تصویر دیکھتے ہی میری نظر انتخاب نے فیصلہ کر لیا۔ اور شکر ہے کہ میری نگاہ نے غلطی نہ کی۔

اس نے میری طرف چہچہاتے پرفسوں سے دیکھا۔ اس کی آواز میں نغمگی تاثیر تھی۔ نورانی اور دلاویز، اور اس کے خیالات نئی روشنی کے خیالات تھے حقیقی لباس میں، برہنہ اور ہولناک مگر اس آخری جملہ نے جو مجھ سے تعلق رکھتا تھا۔ مجھے متوالا کر دیا۔ میری رگوں میں رعشہ سا آگیا۔ معلوم نہیں کیوں؟ معنوی خوبیوں کے مقابلہ میں ظاہری اوصاف کی تعریف سے ہم زیادہ محظوظ ہوتے ہیں۔ اور ایک حسینہ کی زبان پر تو وہ چلتا ہوا جادو ہے۔ میں بولا حتی الامکان جناب کو مجھ سے شکایت کا کوئی موقعہ نہ ملے گا۔

حسینہ نے معترف انداز سے میری طرف دیکھ کر فرمایا۔ مجھے اس کا یقین ہے میری قیافہ شناسی نے اتنا پہلے ہی بتلا دیا تھا۔ اب کچھ معاملہ کی گفتگو ہو جانی چاہیے یہاں آپ میرے مہمان رہیں گے۔ اس جھونپڑے کو خانہ بے تکلف سمجھئے۔ میرے تعلقات نہایت وسیع ہیں۔ دنیا کے ہر ایک گوشہ میں میرے کرم فرما موجود ہیں۔ اور مجھے اکثر یاد کیا کرتے تھے۔ ان احباب کو میں آپ کے سپرد کرتی ہوں۔ ان میں آپ مختلف مزاج اور خواص کے انسان پائیں گے۔ کوئی مجھ سے مدد مانگتا ہے۔ کوئی میری شکایت کرتا ہے۔ کوئی مجھے سراہتا ہے۔ کوئی مجھے کوستا ہے۔ اب سب حضرات کو شافی جواب دینا آپ کا کام ہو گا۔ دیکھئے۔ یہ آج کے خطوط کا انبار ہے۔

ایک صاحب فرماتے ہیں، بہت عرصہ ہوا، آپ کی تحریک سے اپنے بڑے بھائی کے انتقال کے بعد ان کی جائداد پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب ان کا لڑکا بالغ ہو گیا ہے اور مجھے اپنی جائداد کی واپسی کے لیے مجبور کرتا ہے۔ اتنے عرصے تک میں اس جائداد پر قابض تھا۔ اس سے دست بردار ہونا شاق گزرتا ہے۔ اب آپ کے مشورہ کا منتظر ہوں۔ انہیں جواب دیجئے۔ کرفی الحال لطائف الحیل سے کام لو۔ لڑکے سے ہمدردی ظاہر کرو، اسے ملالو۔ تب اسے غافل پاکر اس سے ایک سادے اسٹامپ پر دستخط کرالو۔ بعد ازاں پٹواری اور دیگر عمّال کی مدد سے اس اسٹامپ پر جائداد کا بیعنامہ لکھا لو۔ اگر ایک خرچ کر کے دو ملتے ہوں تو تامل نہ کرو۔

مجھے اس جواب پر سخت حیرت ہوئی۔ اخلاقی احساس کو چوٹ سی لگی۔ اس کی طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔ یہ تو انصاف سے بعید معلوم ہوتا ہے۔

نائن کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اور بولی۔ "انصاف! یہ کتابی عالموں کا ایجاد کیا ہوا گورکھ دھندا ہے۔ دنیا میں اس کا وجود نہیں، باپ قرض کھا کر مر جائے۔ لڑکا کوڑی کوڑی بھرے۔ علماء کے نزدیک یہ انصاف ہے! میں اسے ظلم کہتی ہوں۔ اس انصاف کے پردے میں گانٹھ کے پورے مہاجن کی دست درازی صاف نظر آتی ہے۔ ایک ڈاکو کسی سرکاری عملے کے گھر میں ڈاکہ مارتا ہے اور گرفتار ہو کر جیل خانے جاتا ہے۔ علماء سے انصاف کہتے ہیں۔ مگر یہاں بھی وہی دولت اور حکومت کی زبردستی ہے۔ عملے صاحب نے کتنے ہی گھروں میں ڈاکا مارا۔ اور کتنوں ہی کا گلا دبا دیا۔ اور اس طرح روپیہ کا انبار جمع کیا۔ کسی کو ان کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ڈاکو نے جب ان کا گلا دبایا تو وہ اپنی دولت، ہوشیاری

چالاکی، فریب اور طاقت کا راج ہے۔ یہی کارزار ہستی ہے۔ یہاں ہر ایک تدبیر جس سے ہمارا کام نکلے۔ جس سے ہم اپنے دشمنوں پر ظفریاب ہوں۔ جائز اور مباح ہے۔ دھرم یدھ کے دن اب نہیں رہے۔ یہ دیکھیے، ایک دوسرے صاحب کا شکایت نامہ ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ میں نے اوّل میں ایم۔ اے پاس کیا۔ اوّل درجہ میں قانون کی سند حاصل کی ہے۔ پر اب کو میری بات نہیں پوچھتا۔ اب تک امید تھی۔ کہ قابلیت اپنا اثر ضرور دکھائے گی۔ مگر تین سال کے تجربہ سے معلوم ہوا کہ یہ محض کتابی قانون ہے۔ اس عرصہ میں بزرگوں کی کمائی بھی گاؤ خورد ہو گئی۔ اب مایوس ہو کر آپ کے آستانہ پر فرق نیاز جھکاتا ہوں۔ مجھ بدنصیب کے حال زار پر رحم کیجیے۔ اور میرا بیڑا پار لگائیے۔ انہیں جواب دیجیے۔ کہ جعلی دستاویزیں بنائیے۔ اور فرضی موکلوں کی طرف سے دعویٰ دائر کر کے ڈگری کرا لیجیے۔ یقیناً چند ماہ میں آپ کی نحوست دور ہو جائے گی۔ یہ دیکھئے، ایک اور صاحب فرماتے ہیں۔ لڑکی سیانی ہو گئی ہے۔ جہاں جاتا ہوں۔ لوگ جہیز کی گٹھری مانگتے ہیں۔ یہاں نان شبینہ کا ٹھکانا نہیں۔ کسی طرح وضعداری نبھاتا ہوں، بدنامی ہو رہی ہے۔ جیسا ارشاد ہو تعمیل کروں۔ انہیں لکھیئے، کسی ہفتاد سالہ صاحب جائداد بوڑھے سے شادی کر دیجیے۔ وہ جہیز لینے کی بجائے دینے پر تیار ہو جائے گا۔ میرے خیال میں اب آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ کہ ایسے سائلوں کو کس قسم کا جواب دینے کی ضرورت ہے؟ جواب مختصر ہوں۔ بہت زیادہ توجیہ اور تشریح کی ضرورت نہیں۔ ابھی چند روز یہ کام آپ کو مشکل معلوم ہو گا۔ اکثر کاموں میں آپ کو غور و خوض سے کام لینا پڑے گا۔ مگر آپ طباع آدمی ہیں۔ بہت جلد مہارت ہو جائے گی۔

آپ کی ذات سے ہزاروں بندگانِ خدا کا بھلا ہوگا۔ اور وہ آپ کا جس گائیں گے۔

(۴)

مجھے یہاں رہتے ایک ماہ کے قریب ہوگیا۔ مگر اب تک مجھے یہ نہ معلوم ہوا۔ کہ میں کس کا نمک خوار ہوں۔ وہاں دولت کی کمی نہ تھی۔ تکلفات کے سامان وافر کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ یہ دولت کہاں سے آتی ہے؟ ایک بار سرمہ باز منشی جی سے میں نے اشارۃً اس کا ذکر چھیڑا تھا۔ انہوں نے کہا ان کے ذرائع غیر محدود ہیں۔ دنیا کے ہر ایک گوشہ میں ان کے مرید موجود ہیں۔ وہ انہیں نذریں دیا کرتے ہیں۔ اس سے میں نے یہ اخذ کیا تھا کہ شاید یہاں پیری مریدی کا کوئی سلسلہ ہے۔ مگر یہ نازنین کون ہے؟ آیا کوئی خوش نصیب پروانہ ہے۔ جو اس شعلہ پر نثار ہوتا ہے؟ یہ راز سربستہ ہی رہا۔ مجھے قریب قریب روز اس سے نیاز حاصل ہوتا تھا۔ آہ! اس کے روبرو بیٹھ کر میں بے خود ہو جاتا تھا۔ اس کی نگاہوں میں زبردست قوت جاذبہ تھی۔ جو میری روح کو رگوں سے کھینچ لیا کرتی تھی۔ میرا یارائے گفتار سلب ہو جاتا تھا۔ بس چھپی ہوئی۔ وزدیدہ آنکھوں سے تاکا کرتا۔ وہ بھی مجھ سے غیر ملتفت نہ تھی۔ پر نہ معلوم کیوں۔ مجھے اس کی سحر انگیز نگاہوں اور پرشوق ادا میں محبت کی جھلک نظر نہ آتی تھی؟ نگاہیں تیر کی طرح صرف چھیدتی تھیں کہنا حرف بے تاب کرتے تھے۔ شکاری کو اپنا شکار کھلانے میں جو لطف آتا ہے۔ وہی بے رحمانہ مسرت اس نازنین کو میری وارفتگی سے حاصل ہوتی تھی وہ شعلہ دل بے تاب کو کیا تسکین دے سکتا ہے؟ باوجود اس کے میں پروانہ وار اس شعلہ پہ نثار ہونا چاہتا تھا۔ مجھے اب تک عشاق کا مرغ بسمل کی طرح تڑپنا محض تشبیہ

تخیل معلوم ہوتا تھا۔ پر اس وقت میری بعینہٖ یہی حالت تھی۔ جی چاہتا تھا۔ کہ کسی طرح ان قدموں پر سر رکھ کر جان دے دوں۔ رفعت حسن نے دل سے شوق اور تمنا کو مٹا کر صرف جانبازی کی حسرت رکھ چھوڑی تھی۔ کبھی کبھی جب وہ اپنے تیز رو موٹر بوٹ پر بیٹھ کر ساگر کی سیر کرتی۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا شفق میں چاند تیر رہا ہے۔

اپنے کار منصبی میں مجھے اب کافی مہارت ہو گئی تھی۔ روز خطوط کا ایک دفتر میرے پاس آتا معلوم نہیں کس ڈاک سے ان پر مہر کا کوئی نشان نہ ہوتا تھا۔ مجھے ان سائلوں میں اکثر وہ اسمائے گرامی نظر آئے جن کی اب تک میرے دل میں سچی عزت تھی۔ کتنے ہی ایسے حضرات تھے۔ جن کی میں پرستش کرتا تھا۔ بڑے بڑے نامور پروفیسر، اور مصنف، بڑے بڑے صاحب ثروت، روسا حتیٰ کہ کتنے ہی ہادیان مذہب روز اپنی مصیبت کی داستان سناتے۔ ان کی حالتیں واقعی قابلِ رحم تھیں۔ مجھے رفتہ رفتہ یہ معلوم ہو جاتا تھا۔ کہ ابتدائے آفرینش سے باوجود لاکھوں صدیاں گزر جانے کے انسان ویسا ہی وحشی، ویسا ہی غضب ناک، جذبات کا غلام ویسا ہی خود غرض، ویسا ہی خونخوار بنا ہوا ہے۔ ہادیان دین اور معلمان اخلاق کی کوششیں مطلق کامیاب نہیں ہوئیں۔ بلکہ اس زمانہ میں لوگ سادگی کے باعث اس قدر کینہ پرست، اس قدر بغض پرور اور اپنی سفاکیوں میں اس قدر ہنر مند اور چالاک نہیں تھے۔ ان میں کتنے ہی خطوط شکریہ کے ہوتے تھے۔ اکثر چٹھیاں ان لوگوں کی ہوتی تھیں۔ جو کسی سابقہ موقع پر اس نازنین کے مشورہ پر عمل کر چکے تھے۔ اور اب اس کے نتائج بھگت رہے تھے۔ وہ زیادہ تر دشنام اور لعن طعن

سے پرہوتی تھیں۔ ایک روز اپنے کالج کے ایک پروفیسر صاحب کا خط ملا یہ حضرت سب پروفیسروں سے زیادہ نیک نام تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا، کہ ان کا نامۂ اعمال از سرتاپا سیاہ تھا۔ ان خطوط کو دیکھ کر اس تاریک، متعفن پستی کا اندازہ ہوسکتا تھا۔ جہاں تک انسان جاسکتا ہے۔ ایک ایک خط عبرت کا دفتر تھا۔ اور وائے برحال من! محض اپنے ذاتی فائدے کے لیے میں انسانی اور روحانی فرائض کو طاق پر رکھ کر گمراہیوں کا آلۂ تاریک بنا ہوا تھا۔ معلوم نہیں مجھ بدنصیب کے ہاتھوں کتنے گھر تباہ ہوئے ہوں گے۔ اور کتنی زندگیاں خاک میں مل گئی ہوں گی۔

ایک روز شام کے وقت نازنین نے مجھے یاد کیا۔ میں اپنی شوریدہ سری کے زعم میں سمجھتا تھا۔ کہ میرے مردانہ حسن اور بانکپن کا اس پر ضرور کچھ نہ کچھ اثر ہوتا۔ اپنا بہترین سوٹ پہنا۔ بال سنوارے اور متین لاپرواہی کے ساتھ اس کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ اگر وہ مجھے اپنا شکار بناکر کھیلتی تھی۔ تو میں بھی شکار بن کر اسے کھلانا چاہتا تھا۔ اگر وہ جفاکار تھی۔ تو میں بھی اس کی تاثیر حُسن سے متاثر نہ ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ اگر میں اسے رحم سمجھتا تھا۔ تو اسے بھی مجھے بے نیاز سمجھنے میں کوئی امر مانع نہ ہوسکتا تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی اس نے ایک دلاویز تبسم سے میرا استقبال کیا۔ مگر چہرہ کچھ مضمحل تھا میں بے تاب ہوکر بولا۔ کیا دشمنوں کی طبیعت کچھ ناساز ہے؟

اس نے حسرتناک انداز سے جواب دیا۔ جی ہاں! قریب ایک مہینہ سے ایک درد لاحق ہوگیا ہے۔ اب تک طبیعت کو سنبھالتی رہی۔ پر اب مرض روز پکڑتا جاتا ہے۔ اس کی دوا ایک بڑے بے رحم آدمی کے پاس ہے۔ وہ مجھے روز تڑپتے

دیکھتا ہے۔ اور اس کا دل ذرا بھی نہیں پسیجتا۔"

میں کنایہ سمجھ گیا۔ بدن کی ایک ایک رگ میں بجلی کی سی حرکت ہو گئی۔ تنفس میں طوفان آگیا۔ بے باک ہو کر بولا۔ ممکن ہے۔ جسے آپ نے بے رحم سمجھ رکھا ہے۔ اُسے آپ سے بھی یہی شکایت ہو۔ مگر حالات سے مجبور ہو کر حرف شکایت زبان پر نہ لا سکتا ہو۔

حسینہ نے کہا تو کوئی ایسا علاج بتلائیے۔ جس سے طرفین کی شکایتیں رفع ہو جائیں۔ بے تابیٔ درد نے مجھے بتا دیا ہے۔ میرے دل میں زیادہ پردہ داری کی گنجائش نہیں ہے۔ میرا دل و جان آپ کی نظر ہے۔ میرے وہ خزانے ہیں۔ جو کبھی خالی نہ ہوں گے۔ آپ کو میں شہرت کے معراج پر پہنچا دوں گی۔ میری آغوش میں آ کر دل بے قرار کو تسکین دیجیے۔

نازنین کا چہرہ سرخ انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ نشۂ شوق سے سرشار وہ آغوش کھولے ہوئے میری طرف بڑھی۔ مگر جس طرح تنکا شعلہ د در بھاگتا ہے۔ اُسی طرح میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس گرمیٔ محبت سے مجھے ایک وحشت سی ہو گئی۔ دل پر ایک موہوم دہشت کا غلبہ ہوا، میں گھبرا گیا۔

حسینہ ٹھٹک گئی۔ جس طرح شکار کے چھن جانے سے شیرنی برہم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح قہر کی نگاہوں سے دیکھ کر بولی "یہ گریز کیوں"؟

میری زبان سے اضطراری طور پر نکلا "میں آپ کا جاں نثار خادم ہوں۔ اس اعزاز کے قابل نہیں۔"

حسینہ نے غضب ناک ہو کر کہا "آپ مجھ سے نفرت کرتے ہیں"؟

میں نے مودبانہ انداز سے جواب دیا۔ "اس کا کبھی خواب میں بھی گمان نہ کیجئے۔ آپ شمع ہیں، میں پروانہ ہوں۔ میرے لیے اتنا ہی اعزاز کافی ہے۔ آپ ذرہ نوازی فرمانا چاہتی ہیں۔ تو سوچنے کا موقع دیجیئے۔"

حسینہ غصہ مایوس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اور بولی، آپ سچ مچ ظالم اور بے رحم ہیں۔ میں آپ کو ایسا نہ سمجھتی تھی۔

میں نے زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ جب اپنے کمرہ میں آکر دل میں اس واقعہ کو تولنے لگا۔ تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں انگن کنڈ میں گرتے گرتے بچا کوئی غیبی قوت میری معاون ہوگئی۔ یہ غیبی قوت کیا تھی؟ میرا اخلاقی احساس جو اتنے عرصہ تک مجہول رہنے کے بعد بھی بالکل بے جان پامال نہ ہوا تھا۔ میں اس کی صورت پر فریفتہ تھا۔ لیکن اس کی فتنہ بازیوں اور ادائے فریبیوں سے نفرت کرتا تھا۔ جسم اس کی طرف خود بخود کھینچتا تھا۔ مگر روح دور بھاگتی تھی۔

(۵)

جس کمرہ میں میں مقیم تھا۔ اس کے سامنے جھیل کی دوسری طرف ایک چھوٹا سا شکستہ حال جھونپڑا تھا۔ اس میں ایک خمیدہ کمر مگر نورانی صورت پیر مرد رہا کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی اس محل میں آیا کرتے تھے۔ نازنین معلوم نہیں کیوں ان سے نفرت کرتی تھی۔ شاید دل میں ان سے خائف تھی۔ مجھے تعجب ہوتا تھا۔ کہ اتنی بار ثروت ہو کر بھی وہ ایک خستہ حال بڈھے سے کیوں ڈرتی ہے۔ انہیں دیکھتے ہی نازنین کا رنگ فق ہو جاتا تھا۔ اپنے کمرہ میں جا کر چھپ جایا کرتی تھی۔ دو چار مرتبہ اس نے مجھ سے بھی اشارۃً پیر مرد کا ذکر کیا تھا۔ لیکن بہت حقارت کے ساتھ۔

رات کو مجھے دیر تک نیند نہیں آیا۔ ادھیڑ بن میں مصروف تھا. کبھی جی چاہتا. کہ آؤ۔ آنکھ بند کر کے بہارِ حسن لوٹیں. دنیا کی نعمتوں کا لطف اٹھائیں جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا. ایسے زریں مواقع کہاں سے نصیب ہوتے ہیں۔ پھر خود بخود طبیعت کھنچ جاتی. اور الہام سا ہوتا کہ اس طلسم میں قدم نہ رکھنا ورنہ تا زیست نہ نکل سکو گے۔

رات کے دس بجے ہوں گے کہ دفعتہً میرے کمرے کا دروازہ خود بخود کھل گیا۔ اور وہی پیر مرد اندر داخل ہوئے۔ حالاں کہ میں اپنی مالکہ کی ناراضگی کے خوف سے کبھی ان سے ہم کلام نہ ہوا تھا. لیکن ان کے روئے مبارک پر تقدس کی ایسی شان تھی. کہ خواہ مخواہ ان کے فیض صحبت کا اشتیاق ہوتا تھا۔ میں نے تعظیم کی اور لاکر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ انہوں نے میری طرف ترحم کی نگاہ سے دیکھ کر پوچھا. میرا مخل ہونا ناگوار تو نہیں ہے۔

میں نے سر جھکا کر جواب دیا "جناب کی تشریف آوری میں عین اعزاز کا باعث ہے۔"

پیر مرد بولے۔ اچھا تو سنو اور ہوشیار ہو جاؤ۔ تمہارے اوپر ایک بلائے عظیم آنے والی ہے. تمہارے لیے اس وقت سب سے بہتر تدبیر یہی ہے۔ کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ تا زیست کفِ افسوس ملتے رہو گے۔ میرا جھونپڑا تمہارے سامنے تھا۔ مگر تم نے کبھی مجھ سے ملنے کی ضرورت نہ سمجھی. کاش تم پہلے دن مجھ سے ملتے تو ہزاروں خاندانوں کو تباہ کرنے والا عذاب تمہارے سر پر نہ ہوتا۔ تعجب تو یہ ہے، کہ تم ایسے بیدار مغز ہو کر اس دام میں کیوں کر آ پھنسے؟۔ اور اس سے زیادہ تعجب یہ یہ ہے کہ پھنس کر تم کیوں کر نکل سکے. اگر حسینہ ایکبار تمہیں اپنے آغوشِ محبت میں لے لیتی.

تو پھر تمہارے لیے کوئی امید نہ تھی۔ تم اسی وقت اس کے عجائب خانہ میں داخل کر دیئے جاتے۔ وہ جس پر ریجھتی ہے۔ اس کی یہی گت بناتی ہے۔ یہی اس کی محبت ہے۔ چلو ذرا اس عجائب خانہ کی سیر کرو تب تم سمجھو گے کہ تمہارے باموقع گریز نے تمہیں کس آفت سے بچا لیا۔

یہ کہہ کر پیر مرد نے دیوار میں ایک بٹن دبایا۔ فوراً ایک دروازہ نمودار ہوا۔ وہ نیچے جاتے کا زینہ تھا۔ پیر مرد داخل ہوئے اور مجھے بھی بلایا۔ تاریکی میں کئی زینے اترنے کے بعد ایک وسیع کمرہ نظر آیا۔ اس میں ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ وہاں میں نے جو نفرت انگیز و دلخراش نظارے دیکھے۔ انہیں یاد کر کے آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اطالیہ کے زندہ جاوید ڈینٹی نے دوزخ کا جو سین دکھایا ہے۔ اس سے کہیں ہولناک۔ کہیں پر اشکراہ سین میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ جا بجا نجاست اور غلاظت میں لپٹے ہوئے آدمی زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ ان کے اعضاء انسانی تھے لیکن صورتیں مسخ ہو گئی تھیں۔ کوئی کتے سے مشابہ تھا۔ کوئی گیدڑ سے۔ کوئی بن بلاؤ سے ملتا تھا۔ کوئی سانپ سے۔ ایک گوشہ میں کوئی موٹا تازہ آدمی ایک نحیف وخستہ آدمی کے جگر میں منہ لگائے اس کا خون چوس رہا تھا۔ ایک طرف دو گدھ کی صورت والے انسان ایک کرم خوردہ لاش پر بیٹھے۔ پنجہ و منقار سے ایک دوسرے کو نوچ رہے تھے۔ ایک

جگہ ایک اژدہے کی صورت والا آدمی ایک بچے کو نگلنا چاہتا تھا۔ پر حلق میں کافی گنجائش نہ ہونے کے باعث بیتاب ہو کر زمین پر لوٹتا تھا اور چیختا تھا۔ ایک جگہ میں نے خون کو منجمد کرنے والا نظارہ دیکھا۔ دو ناگن کی شکل کی عورتیں ایک بھیڑیے کی صورت والے انسان کے گلے میں لپٹی ہوئی اُسے کاٹ رہی تھیں۔ اس کے بدن سے خون کے فوارے جاری تھے۔ مجھ سے اب اور نہ دیکھا گیا۔ فوراً وہاں سے بھاگا اور گرتا پڑتا اپنے کمرہ میں آپہنچا۔ پیر مرد بھی میرے ساتھ چلے آئے۔ جب میرے ہوش ذرا بجا ہوئے تو انہوں نے کہا۔ تم اتنے جلد گھبرا گئے۔ ابھی تو ایک گوشہ بھی نہیں دیکھا۔ یہ تمہاری مالکہ کی سیرگاہ ہے۔ یہ ان کے پالتو جانور ہیں۔ ان کی حرکات دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی ہیں۔ انہوں نے اس عجائب خانہ میں چن چن کر آدمی رکھے ہیں۔ تمہیں بھی اسی لیے منتخب کیا تھا۔ معلوم نہیں کیا بنانا چاہتی ہیں۔ وہ نت نئے جال بناتی رہتی ہے۔ اب کے کسی تعلیم یافتہ آدمی کو پھانسنا چاہتی تھی۔ اسی لیے پرائیویٹ سیکرٹری کا اشتہار دے رکھا تھا۔ اب میری یہی صلاح ہے کہ اسی وقت یہاں سے بھاگو ورنہ حسینہ کے دوسرے وار سے نہ بچ سکو گے۔

یہ کہہ کر پیر مرد غائب ہو گئے۔ میں نے ابھی اپنا بقچہ سنبھالا اور آدھی رات کے سناٹے میں چوروں کی طرح کمرہ سے باہر نکلا۔ فرحت بخش ہوائیں چل رہی تھیں۔ سامنے جھیل میں تارے تھرک رہے تھے

حنا کی خوشبو سے ہوا معطر تھی اور جھیل کے اس پار پیر مرد کی شکستہ جھونپڑی میں روشنی کی جھلک دکھائی دیتی تھی میں نے سیدھا راستہ چھوڑ دیا اور جھیل کے کنارے کیچڑ میں پھنستا سڑک تک آپہنچا کس شان سے آیا تھا کس ہیئت کذائی سے جا رہا تھا؟ لیکن دل میں ایسا خوش تھا جیسے کوئی چڑیا پنجہ باز سے چھوٹ جائے۔

گو میں ایک مہینہ کے بعد لوٹا تھا۔ پر معلوم نہیں۔ کیوں نہ ابھی تک گھر کے آدمیوں کو اور نہ احباب کو میری فکر تھی۔ کمرہ میں ذرا بھی گرد و غبار نہ تھا۔ میں نے جب اپنے گھر پر اس واقعہ کا ذکر کیا تو لوگ خوب ہنسے اور احباب تو ابھی تک مسخر کیا کرتے ہیں۔ کہیں ایک لمحہ کے لیے بھی کمرہ سے باہر نہیں نکلا۔ ایک مہینہ غائب رہنے کا ذکر ہی کیا؟ اس وجہ سے اب مجھے بھی مجبوراً یہی کہنا پڑتا ہے کہ شاید میں نے کوئی خواب دیکھا ہو۔ بہر حال جو کچھ ہوا میں خدا کا ہزار ہا شکر کرتا ہوں کہ میں اس آزمائش سے بچ کر نکل آیا۔ مگر اس کے ساتھ مجھے اس آزمائش میں پڑنے کا افسوس نہیں ہے کیونکہ اس نے ہمیشہ کے لیے میری آنکھیں کھول دیں۔

دھوکا

ستی کُنڈ میں کھلے ہوئے کنول بسنت کے دھیمے دھیمے جھونکوں سے لہرا رہے تھے۔ صبح کی سکون بخش سنہری کرنیں ان سے گلے مِل مِل کر مسکراتی تھیں جِس کے پھول وفا کے سنہرے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

راجکماری پربھا کنڈ کے کنارے ہری ہری گھاس پر کھڑی خوشنوا چڑیوں کے نغمے سن رہی تھی۔ اس کا کندنی رنگ انہیں پھولوں کی طرح دمک رہا تھا۔ صباحت کی ایک تصویر تھی۔ جو آفتاب کی زرّیں شعاعوں سے بنائی گئی تھی۔

پربھا نے مولسری کے درخت پر بیٹھی ہوئی ایک شیاما کی طرف دیکھ کر کہا۔

میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی ایسی ہی چڑیا ہوتی۔

اس کی سہیلی امبا نے مسکرا کر پوچھا "یہ کون ؟"

پربھا نے کنڈ کی طرف تاکتے ہوئے جواب دیا "پیڑ کی ہری بھری ڈالیوں پر بیٹھی ہوئی چہچہاتی۔ میری شیریں نوائیوں سے سارا باغ گونج اٹھتا"
امبا نے چھیڑ کر کہا۔ نوگڑھ کی رانی ایسی کتنی ہی چڑیوں کا گانا جب چاہے سن سکتی ہے۔
پربھا شرم سے سر جھکا کر بولی۔ مجھے نوگڑھ کی رانی بننے کی آرزو نہیں ہے میرے لیے کسی ندی کا سنسان کنارہ چاہیئے۔ ایک بین، اور دوسرے خوشنوا پرندوں کی صحبت نغمۂ شیریں میں میرے لیے ساری دنیا کی نعمتیں بھری ہوئی ہیں۔
پربھا نے شاعرانہ مزاج پایا تھا۔ اور اکثر ایسے سپنے دیکھا کرتی تھی۔ امبا کچھ جواب دینا چاہتی تھی۔ کہ اتنے میں باہر سے کسی کے گانے کی آواز آئی۔

کر گئے تھوڑے دن کی پریت

پربھا نے ہمہ تن گوش ہو کر سنا۔ اور بیقرار ہو کر بولی، بہن اس آواز میں جادو ہے۔ مجھ سے اب بغیر سنے نہیں رہا جاتا۔ اسے اندر بلا لاؤ۔
امبا پر بھی نغمہ کا جادو اثر کر رہا تھا۔ بولی آج تک بے شک ایسا راگ میں نے نہیں سنا۔ کھڑکی کھول کر بلا لاتی ہوں۔
تھوڑی دیر میں راگیا اندر داخل ہوا۔ شکیل خوش قامت نوجوان تھا۔ برہنہ پا برہنہ سر کندھے پر ایک مرگ چھالا تھا۔ بدن پر گیروے رنگ کی کفنی، اور ہاتھوں میں ایک ستارہ، چہرہ سے نور برس رہا تھا۔ اس نے دبی ہوئی نگاہوں سے دونوں حسینوں کو دیکھا۔ اور تب سر جھکا کر بیٹھ گیا۔
پربھا نے بھی جھجکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ اور نگاہیں نیچی ہو گئیں۔

امبا نے کہا، جوگی جی! ہمارے بڑے بھاگ تھے۔ کہ آپ کے درشن ہوئے۔ ہم کو بھی کوئی پد سنا کر کرتار تھ کیجیے۔ جوگی نے سر جھکا کر جواب دیا "ہم جوگی لوگ نرائن کا بھجن کرتے ہیں۔ ایسے ایسے درباروں میں ہم کیا گا سکتے ہیں۔ پر آپ کی مرضی ہے تو سنیے۔

کر گئے تھوڑے دن کی پریت

کہاں وہ پریت، کہاں وہ بچھڑون، کہاں دھوبن کی ریت

کر گئے تھوڑے دن کی پریت

جوگی کی رسیلی اور پُر درد آواز، ستارہ کی زمزمہ سنجیاں، اس پر نغمہ کی لطافت پربھا کو بیخود کیے دیتی تھیں۔ اس نے بڑی درد رس طبیعت پائی تھی اور اس کا ذوقِ نغمہ نہایت لطیف تھا۔ جس طرح ستار کے زمزمے ہوا میں گونج رہے تھے اسی طرح پربھا کے دل میں شیریں تصورات کی ترنگیں اٹھ رہی تھیں۔ سوتے ہوئے جذبات کی نیندیں ٹوٹ گئیں۔ دل سرزمینِ خواب میں جا پہنچا۔ سنی کنڈ کے کنول طلسم کی پریاں بن بن کر منڈلاتے ہوئے بھونروں سے دست بستہ اور باچشمِ پُر آب کہتی تھی۔

کر گئے تھوڑے دن کی پریت

سُرخ اور سبز پتیوں سے لدی ڈالیاں، حجاب سے سر جھکائے جھکتی ہوئی پتیوں سے رو رو کہتی تھیں۔

کر گئے تھوڑے دن کی پریت

اور راجکماری پربھا کا دل بھی ستار کی مستانہ اداؤں کے ساتھ گونجتا تھا۔

کر گئے تھوڑے دن کی پریت

(۲)

پربھا بھگولی کے راؤ دیوی چند کی اکلوتی بیٹی تھی۔ راؤ صاحب پرانے وقتوں کے رئیس تھے۔ کرشن کی اپاسنا میں غرق رہتے جس کا ایک خاص جزو سماع ہے اس لیے اِن کے دربار میں دُور دُور سے کلاونت اور گویئے آیا کرتے۔ اور انعام واکرام پاتے۔ راؤ صاحب کو نغمہ سے عشق تھا خود بھی اس فن کے استادِ کامل تھے۔ اگرچہ اب پیرانہ سالی کے باعث کاوش کی طاقت باقی نہ تھی۔ پر اس فن کے رموز و نکات کے ماہر تھے۔ پربھا بچپنے ہی سے ان صحبتوں میں بیٹھنے لگی۔ اور کچھ طبعی مناسبت اور کچھ شب و روز کے چرچوں کے طفیل اسے بھی اس فن میں درخور ہو گیا تھا۔ اس وقت اس کے حسن کا شہرہ تھا۔ راؤ صاحب نے نوگڑھ کے جوان بخت اور نیک نہاد راجہ ہری چند سے اس کی شادی تجویز کی تھی۔ طرفین سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ راجہ ہری چند مئو کالج اجمیر کے متعلم تھے۔ اور نئی تہذیب کے دلدادہ، ان کی استدعا تھی۔ کہ انہیں ایک بار راجکماری پربھا سے بالمشافہ ہمکلام ہونے کا موقع دیا جائے۔ پر راؤ صاحب اس گناہِ عظیم کے مرتکب نہ ہو سکتے تھے۔

پربھا راجہ ہری چند کے نئے خیالات کے چرچے ہی اس تعلق سے بہت مطمئن نہ تھی۔ پر جس وقت اس نے اس باکمال اور نوجوان جوگی کا گانا سنا تھا۔ اس وقت سے وہ اسی کے دھیان میں ڈوبی رہتی۔ اما اس کی سہیلی تھی۔ ان کے درمیان کوئی پردہ نہ تھا۔ پر اس راز کو پربھا نے اس سے بھی پوشیدہ رکھا۔

امیا اس کی مزاج شناس تھی۔ معاً تاڑ گئی۔ پر اس نے پند و نصیحت کر کے اس آگ کو بھڑکانا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے خیال کیا کہ کس مپرسی کی حالت میں یہ وہم چند دنوں میں کافور ہو جائے گا۔ جیسا کہ اکثر سودائے خام کا انجام ہوتا ہے۔ مگر اس کا قیاس غلط ثابت ہوا۔ جوگی کی صورت کبھی پربھا کی آنکھوں سے نہ اترتی اسکا مدھر راگ ہر دم اس کے کانوں میں گونجا کرتا۔ اسی کنڈ کے کنارے وہ از خود رفتگی کے عالم میں سارا دن بیٹھی رہتی۔ اور عالمِ خیال میں وہی مدھر دلکش راگ سنتی اور وہی نورانی صورت دیکھتی۔ کبھی کبھی اسے ایسا معلوم ہوتا کہ باہر سے وہ آواز آرہی ہے۔ وہ چونک پڑتی اور وحشت کے عالم میں باغ کی چار دیواری تک جاتی۔ وہاں سے مایوس ہو کر لوٹ آتی اور اپنے تئیں سمجھاتی۔ یہ کیسی حالت ہے؟ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ میں ہندو لڑکی ہوں۔ والدین نے جسے سونپ دیں۔ اس کی لونڈی بن کر رہنا میرا دھرم ہے۔ مجھے دل و جان سے اس کی خدمت کرنی چاہیے۔ کسی دوسرے کا خیال بھی دل میں لانا میرے لیے پاپ ہے۔ آہ! دل میں پریم کا خیال رکھ کر میں کس منہ سے اپنے شوہر کے پاس جاؤں گی۔ ان کانوں سے کیونکر وہ محبت کی باتیں سنوں گی۔ جو میرے لیے طعنے سے بھی زیادہ تلخ ہوں گی؟ ان آنکھوں سے کیسے وہ محبت کی نگاہیں دیکھوں گی۔ جو نگاہِ قہر سے بھی زیادہ دلسوز ہوں گی؟ اس گردن میں وہ محبت کے ہاتھ پڑیں گے۔ جو زنجیر سے بھی زیادہ گراں بار ہوں گے۔ پیارے! تم میرے دل سے نِکل جاؤ۔ یہ جگہ تمہارے لائق نہیں۔ میرا بس ہوتا تو تمہیں دل کی سیج پر سلاتی۔ مگر میں دھرم کی رسیوں میں بندھی ہوئی ہوں۔

اس طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ بیاہ کے دن نزدیک آتے جاتے تھے اور پربھا کا

کنول سا چہرہ مرجھا جاتا تھا۔ کبھی کبھی ان حسرت ناک خیالوں سے بے چین ہو کر اس کا جی چاہتا کہ کنڈ کی گود میں پناہ لوں۔ لیکن راؤ صاحب پر اس صدمۂ جانکاہ کے اثر کا خیال کر کے رک جاتی۔ اور سوچتی میں ان کا سرمایۂ زندگانی ہوں۔ مجھ بدنصیب کو انہوں نے کس ناز و نعمت سے پالا ہے۔ میں ہی ان کی زندگی کا سہارا اور ان کی آخرت کی امید ہوں۔ نہیں یوں خیال ہے کہ میں ان کی آرزوؤں کا خون نہ کروں گی۔ میرے دل پر جو چاہے گزرے، انہیں نہ کڑھاؤں گی۔

بظاہر پربھا کا ایک گویّے جوگی کے پیچھے دیوانہ ہو جانا سبکسری معلوم ہوتی ہے اس کے نغمے تان سین کی تانوں سے بھی زیادہ دلربا کیوں نہ ہوں۔ پر ایک راجکماری کے لیے اس کے ہاتھوں بک جانا حد درجہ کی کمزوری کہی جا سکتی ہے۔ لیکن راؤ صاحب کے دربار میں علم کا، شجاعت کا، مردانہ جاں نثاریوں کا کوئی چرچا نہ تھا۔ جن سے حسن کی کلیاں کھلتی ہیں۔ وہاں تو شب و روز زمزمہ سنجیوں کے دور رہتے تھے۔ اس فن کے ماہر اعزاز کی مسند پر جلوہ افروز ہوتے تھے۔ اور انہیں پر تحسین کے بہترین جواہر لٹائے جاتے تھے۔ وہاں گانا ہی کمال کا معیار تھا۔ پربھا نے آنکھیں ہی یہی صحبتیں دیکھی تھیں۔ اور اس پر ان کا گاڑھا رنگ چڑھ گیا تھا۔ ایسی حالت میں اس کی طبیعت نے جو روش اختیار کی۔ اس پر تعجب کا کوئی مقام نہیں۔

(۳)

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ راؤ صاحب نے پربھا کو گلے سے لگا لیا اور رو رو کر رخصت کیا۔ پربھا بھی بہت روئی۔ امّا کو تو وہ کسی طرح چھوڑتی ہی نہ تھی۔

نوگڑھ بڑی ریاست تھی اور راجہ ہری چند کی خوش انتظامی کے باعث رونق پر تھی - پربھا کی خدمت کے لیے لونڈیوں کی ایک فوج تھی - اس کے لیے آنند بھون سجایا گیا تھا۔ جسے قدرت نے فضا دی تھی، اور صنعت نے فرحت، مشاطہ نے دلہن کو خوب سنوارا۔ راجہ صاحب شوق دیدار سے بے چین تھے - اندر گئے - پربھا نے ہاتھ جوڑے ہوئے سر جھکا کر ان کا خیر مقدم کیا۔ مگر آنکھوں سے آنسو کی ندی بہہ رہی تھی - دولہا نے عاشقانہ جوش سے گھونگھٹ ہٹا دیا۔ حسن کا چراغ تھا، پر بے نور -

دوسرے دن سے راجہ صاحب کی یہ کیفیت ہوئی کہ بھونرے کی طرح ہر دم اس پھول پر منڈلایا کرتے۔ نہ امور ملکی کی فکر تھی۔ نہ سیر و شکار کی پروا - پربھا کی باتیں نغمہ تھیں - اس کی نگاہیں ساغر، اور اس کے دیدار میں سیر کہسار کی دلآویزی تھی۔ محبت کے نشے میں بے خود ہوئے جاتے تھے - وہ کیا جانتے تھے، کہ دودھ میں مکھی ہے -

یہ غیر ممکن تھا کہ راجہ صاحب کی ان دلجوئیوں اور نازبرداریوں کا پربھا پر کوئی اثر نہ ہوتا اور ان سے اظہار تردّد مقصود نہ تھا - اس میں سچا انوراگ بھرا ہوا تھا۔ جو ہم سے محبت کرتا ہے۔ اس سے ہم نفرت نہیں کر سکتے - پربھا دل میں نادم ہوتی وہ اپنے کو ایسی کامل خالص، محبت کے قابل نہ پاتی تھی - اس خلوص کے عوض میں اسے اپنے مصنوعی رنگے ہوئے جذبات ظاہر کرتے ہوئے روحانی صدمہ ہوتا تھا - جب تک کہ راجہ صاحب اس کے ساتھ رہتے، وہ انہیں اپنی شیریں اداؤں میں مخمور رکھتی۔ وہ ان کی گردن میں لتا کی طرح لپٹی ہوئی گھنٹوں پریم کی باتیں کیا کرتی - وہ ان کے ساتھ گلشن کی کیاریوں میں چہلیں کرتی - ان کے لیے پھولوں کے ہار گوندھتی - اور ان کے گلے میں ڈال کر کہتی، پیارے! دیکھنا یہ پھول مرجھا نہ جائیں - انہیں ہمیشہ

تازہ رکھنا۔ وہ چاندنی راتوں میں ان کے ساتھ کشتی پر بیٹھ کر جھیل کی سیر کرتی۔ اور انہیں پریم کے راگ سناتی۔ اگر انہیں باہر سے آنے میں ذرا بھی دیر ہو جاتی تو وہ پرمزہ شکوے کیا کرتی۔ اور انہیں بے رحم اور بے درد کہتی۔ ان کے سامنے خود ہنستی آنکھیں ہنستیں، اور آنکھوں میں کاجل ہنستا تھا۔ مگر آہ! جب وہ اکیلی ہوتی تو طائرِ خیال اڑ کر اسی کنڈ کے کنارے جا پہنچتا۔ کنڈ کا وہ نیلگوں پانی اس پر تیرتے ہوئے کنول اور مولسریوں کی قطاریں آنکھوں کے سامنے آجاتیں پھر امبا مسکراتی، نزاکت سے لچکتی آجاتی۔ اور تب رسیلے جوگی کی دلفریب مستانہ تصویر آنکھوں میں آبیٹھتی۔ اور ستار کے نشہ خیز زمزموں کے ساتھ نغمۂ جاں گداز کی صدائیں آنے لگتیں۔

کر گئے تھوڑے دِنوں کی پریت

تب وہ ایک سرد آہ کھینچ کر اٹھ بیٹھتی اور باہر نکل کر پنجرے میں چہکتی ہوئی چڑیوں کی شیریں نوائیوں میں پناہ لیتی۔ اس طرح یہ خواب پریشان ہو جاتا۔

(۴)

اسی طرح کئی مہینے گذر گئے۔ ایک روز راجہ ہری چند پربھا کو اپنے نگار خانہ میں لے گئے۔ جو استادانِ فن کی سحر طرازیوں کا بے نظیر مجموعہ تھا۔ طاقِ اوّل میں تاریخی تصاویر تھیں۔ داخل ہوتے ہی رانا پرتاپ کی قدِ آدم تصویر نظر آئی جس کے چہرہ سے مردانہ سطوت کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ ذرا آگے بڑھ کر دائیں طرف سرفروش سانگا، جانباز جیمل اور دلیر درگا داس جلوہ افروز تھے بائیں طرف غیور راجیت اور شیر دل بھیم سنگھ بیٹھے ہوئے تھے۔ رانا پرتاپ کے مقابل سلیم،

لالہ ثابت قدم سیواجی کی تصویر تھی۔ طاق کے بالائی حصہ میں آمنے سامنے کامل کرشن اور روشن ضمیر تمام براجتے تھے۔ مصوروں نے چہرہ نگاری میں کمال دکھایا تھا۔ باطن کو ظاہر بنا دیا تھا۔ پربھا نے پرتاپ کے پیروں کو چوما اور کرشن کے سامنے دیر تک آنکھوں میں احترام اور پریم کے آنسو بھرے سر جھکائے کھڑی رہی۔ اس کے دل پر اس وقت ایک تقدس آمیز رعب طاری تھا۔ اسے معلوم ہوتا تھا۔ یہ ان بزرگوں کی تصویریں نہیں۔ بلکہ ان کی پاک روحیں ہیں۔ جن کے کارناموں سے ہندوستان کی تاریخ روشن ہے۔ جو ہندوستان کا بہترین قومی سرمایہ، اعلیٰ ترین قومی یادگار اور بلند ترین قومی نعرے ہیں۔ وہ ان کے سامنے کھڑی نہ ہو سکی۔ اور جلدی سے طاق کے دوسرے حصہ میں داخل ہو گئی۔ یہاں وسط میں نورانی بڈھ یوگ آسن میں بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ ان کے دائیں طرف عارف شنکر تھے اور بائیں طرف بیدار مغز دیانند ایک حصہ میں درویش کبیر اور صاحب دل رام داس پہلو بہ پہلو کھڑے تھے۔ ایک دیوار پر عالی مقام گووند اپنے شہادت کے دونوں تاروں کے ساتھ جلوہ افروز تھے۔ دوسری دیوار پر ہندو فلسفہ کی بزم جاوداں قائم تھی۔ مصوروں کا کمال ایک ایک عضو سے ٹپکتا تھا۔ پربھا نے ان کے قدموں کو بوسہ دیا۔ پھر ان کے سامنے سر نہ اٹھا سکی۔ اسے محسوس ہوتا تھا۔ کہ ان کی منور آنکھیں اس کے دل پر داغ میں چھپی جاتی ہیں۔

اس کے بعد طاق کا تیسرا درجہ آیا۔ شعرائے نازک خیال کی مجلس آراستہ تھی۔ روشن خیال والمیک اور ہمہ گیر ویاس جائے صدر پر رونق افروز تھے۔ داہنے طرف رنگین بیان کالی داس تھے۔ بائیں طرف جدت طراز بھوبوتی۔ قریب ہی بھرتری اپنے گوشۂ قناعت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جانب راست معنی آفرین غالب اور انسانی فطرت

کے رمز شناس انیس تھے۔ جانب چپ پر سطوت ذوق، اور شیریں کلام آتش پُر گو نظیر، زمانہ شناس حالی، لطیف اکبر اور رفیق اقبال نے اس دائرہ کو پورا کر دیا تھا۔

دائیں طرف کی دیوار پر ہندی شعرا کا مجمع تھا۔ صوفی سور، فطرت نگار تلسی، قادرالکلام کیشو، اور عاشق تن بہاری، درجہ بدرجہ جلوہ افروز تھے۔ سُور داس سے پربھا کو روحانی عقیدت تھی۔ اس نے قریب جا کر ان کے قدموں کو بوسہ دینا چاہا۔ دفعتاً انہیں قدموں کے سامنے سر جھکائے اسے ایک چھوٹی سی تصویر نظر آئی۔ پربھا اسے دیکھ کر چونک پڑی۔ یہ وہی تصویر تھی۔ جو اس کے پردۂ دل پر کھینچی ہوئی تھی۔ وہ دو بدو اس کی طرف نگاہ نہ کر سکی۔ دبی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

راجہ ہری چند نے مسکرا کر پوچھا۔ اس شخص کو کہیں تم نے دیکھا ہے؟

اس سوال سے پربھا کا دل کانپ اٹھا۔ جیسے ہرن شکاری کے سامنے راہِ فرار نہ پا کر گھبرایا ہوا۔ اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ اسی طرح پربھا دیوار کی طرف تاکنے لگی سوچنے لگی کیا جواب دوں؟ اس کو کہاں دیکھا ہے؟ انہوں نے یہ سوال مجھ سے کیوں پوچھا کہیں تاڑ تو نہیں گئے؟ یا نارائن میری پت تمہارے ہاتھ ہے۔ کیونکر انکار کروں؟ چہرہ زرد ہو گیا۔ سر جھکا کر دبی ہوئی زبان سے بولی۔ ہاں خیال آتا ہے کہ کہیں دیکھا ہے؟

ہری چند، کہاں دیکھا؟

پربھا کے سر پر چکر سا آنے لگا۔ بولی شاید ایک بار وہ گاتا ہوا میرے باغ کے سامنے سے جا رہا تھا۔ امبا نے بلا کر اس کا گانا سنا تھا۔

ہری چند نے پوچھا، کیسا گانا تھا؟

پربھا کے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ سوچتی تھی۔ راجہ کا ایسی باتیں پوچھنا معنی سے خالی نہیں۔ دیکھوں آج لاج رہتی ہے یا نہیں۔ بولی اس کا گانا تو ایسا برا نہ تھا۔

ہری چند نے شرارت آمیز انداز سے مسکرا کر پھر پوچھا، کیا گایا تھا؟

پربھا اس سوال پر باخبر ہو گئی۔ سوچی اس سوال کا سچا جواب دے دوں۔ تو پھر باقی کیا رہتا ہے۔ یقین ہو گیا۔ کہ آج خیریت نہیں ہے۔ چھت کی طرف دیکھ کر بولی، سور داس کا کوئی پد تھا۔

ہری چند رنے کہا۔ "یہ تو نہیں"۔

کر گئے تھوڑے دن کی پریت

پربھا کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ سر تیورانے لگا۔ کھڑی نہ رہ سکی۔ بیٹھ گئی اور مایوسانہ انداز سے بولی، ہاں یہی پد تھا۔ اور فوراً ہی کلیجہ مضبوط کر کے پوچھا، آپ کو کیسے معلوم ہوا؟

ہری چند ربولے، وہ میرے یہاں اکثر آیا جایا کرتا ہے۔ مجھے بھی اس کا گانا پسند ہے اسی نے مجھ سے یہ حال بتایا تھا۔ مگر وہ تو کہتا تھا۔ کہ راجکماری نے میرے گانے کو بہت پسند کیا اور پھر آنے کے لیے اصرار کیا۔

پربھا کو اب سچا غصہ دکھانے کا موقع ملا۔ تیز ہو کر بولی، یہ بالکل جھوٹ ہے۔ میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔

ہری چند بولے "وہ تو میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ کہ یہ حضرت کی چالاکی ہے۔ ڈینگ مارنا گویوں کا خاصہ ہے۔ مگر اس میں تو تمہیں انکار نہیں۔ کہ اس کا گانا برا نہ تھا" پربھا خفیف ہو کر بولی۔ نہ! اچھی چیز کو برا کون کہے گا۔

ہری چند نے پوچھا، پھر سننا چاہو تو اسے بلواؤں۔ سر کے بل دوڑا آئے گا۔

کیا ان کے درشن پھر ہوں گے؟ امید ہے اس کا چہرہ شگفتہ ہو گیا۔ مگر ان کئی مہینوں کی متواتر کوشش سے جس خیال کو فراموش کرنے میں وہ کسی قدر کامیاب ہو چکی تھی۔ اس کے پھر تازہ ہو جانے کا خوف دامنگیر ہوا۔ بولی، میرا اس وقت گانا سننے کو جی نہیں چاہتا۔

ہری چند نے اصرار کیا۔ "یہ میں نہ مانوں گا، تم اور گانا سننا نہ چاہو۔ میں ابھی اُسے بلائے لاتا ہوں"۔

یہ کہہ کر راجہ ہری چند تیر کی طرح طاق سے باہر نکل آئے۔ پربھا انہیں روک نہ سکی۔ وہ دم بخود فکر میں ڈوبی کھڑی تھی۔ دل میں خوشی اور رنج کی لہریں باری باری سے اٹھتی تھیں۔ مشکل سے دس منٹ گزرے ہوں گے۔ اسی ستار کی مستانہ صداؤں کے ساتھ جوگی کی رسیلی تان سنائی دی۔

کر گئے تھوڑے دن کی پریت

وہی دل آویز نغمہ تھا، وہی جذباتی تاثیر، وہی روحانی دلکشی وہی سب کچھ جو فکر اور تخیل اور جذبات کو مرغزارِ تمنا میں پہنچا دیتا ہے۔

ایک لمحہ میں جوگی کی موہنی صورت دکھائی دی۔ وہی مستانہ پن، وہی نشیلی آنکھیں، وہی دیوتاؤں کی سی صورت، اس کے چہرہ پر ایک ہلکا سا تبسم تھا۔ پربھا نے اس کی طرف سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ دفعتاً اس کا کلیجہ اُچھل پڑا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹ گیا۔ بے خودی کے نشہ سے اُمڈی ہوئی آنکھوں میں پریم کے آنسو بھرے۔ وہ اپنے شوہر کے پیروں پر گر پڑی اور بولی "پریتم"۔

راجہ ہری چند کو آج گرمیِ محبت، خلوصِ جذب، اور تسلیم کامل کا ایک نیا ولولہ انگیز اور سرور افزا تجربہ ہوا۔ وہ ناقابلِ اظہار کمی جو عالمِ خلوص میں بھی

کھٹکا کرتی تھی، دور ہو گئی تھی۔ انہوں نے پربھا کو سینے سے لگا لیا۔ آج ان دونوں دلوں کے درمیان کوئی میل، کوئی حد فاصل، کوئی آڑ نہیں ہے۔ آج ان میں سچا ملاپ ہوا ہے۔

راجہ ہری چند نے کہا، "جانتی ہو میں نے یہ سوانگ کیوں رچا تھا؟ گانے کا مجھے ہمیشہ سے شوق ہے اور سنا کہ تمہیں بھی اس کا جنون ہے۔ تمہیں اپنا دل نظر کرنے سے پہلے ایک بار تمہارا درشن کرنا ضروری معلوم ہوا۔ اور اس کے لیے سب سے بہتر ترکیب یہی نظر آئی۔"

پربھا نے سرشار آنکھوں سے دیکھ کر کہا، "جوگی بن کر تم نے جو کچھ کیا پا لیا۔ وہ راجہ رہ کر تم ہرگز نہ پا سکتے۔ تم میرے پتی رہتے پر پریم نہ ہو سکتے۔ اب تم میرے پتی بھی ہو، اور پریم بھی۔ مگر تم نے مجھے بڑا دھوکا دیا۔ اور میری آتما کو گنہگار بنایا، اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟"

سوت

پنڈت دیودت کی شادی ہوئے ایک زمانہ گزر گیا۔ مگر کوئی اولاد نہ ہوئی، جب تک ان کے ماں باپ زندہ تھے۔ وہ ان سے ہمیشہ دوسری شادی کرنے کے لیے تقاضا اور اصرار کرتے رہے۔ مگر پنڈت جی کبھی اس پر راضی نہ ہوئے۔ انہیں اپنی بیوی گوداوری سے سچی محبت تھی۔ اور اولاد کی آرزو میں وہ اپنی موجودہ عافیت۔ اور اطمینان کو خیرباد نہیں کہنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ نئے خیالات کے آدمی تھے۔ اور ان ذمہ داریوں کو سمجھتے تھے۔ جو اولاد اپنے ساتھ لاتی ہے۔ جب تک انسان میں اتنی مقدرت نہ ہو کہ وہ اپنی اولاد کی کماحقہ پرورش، تعلیم اور تربیت کا کفیل ہو سکے۔ اسے شادی سے محترز رہنا چاہیے۔ اسے وہ خوب سمجھتے تھے۔ پہلے پہلے تو کبھی کبھی بچوں کو ہنستے کھیلتے دیکھ کر ان کے جگر پر ایک چوٹ سی لگتی تھی۔

مگر اب اپنے دیگر ہم وطنوں کی طرح وہ بھی جسمانی عوارض میں مبتلا رہتے تھے۔ اور اولاد کا خیال کرتے ہی انہیں ایک خوف سا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن گوداوری اتنی جلدی مایوس ہونے والی نہ تھی۔ پہلے تو وہ دیوی، دیوتا، گنڈے تعویذ اور جنتر منتر پر معتقد رہی۔ مگر جب اس نے دیکھا۔ کہ ان سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ تو اس نے پنڈت جی کی دوسری شادی کرنے کا منصوبہ کیا۔ اس نے ہفتوں، مہینوں اس فکر میں کاٹے۔ دل کو بہت سمجھایا۔ مگر جو بات من میں سما گئی تھی۔ وہ کسی طرح نہ نکلی۔ ہاں اسے بڑی زبردست قربانی کرنا پڑے گی۔ شاید شوہر کی محبت کا انمول رتن بھی اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔ پر کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ پندرہ سال تک لگاتار جس نخلِ محبت کو پالا۔ اور سینچا۔ کیا وہ ہوا کا ایک جھونکا بھی نہ سہہ سکے گا۔

گوداوری نے آخر کار اولاد کی پرزور خواہش کے سامنے سر جھکا دیا۔ اور سوت کا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔

—— ۲ ——

پنڈت دیودت، گوداوری کی یہ تجویز سنتے ہی ہنس پڑے۔ انہوں نے قیاس کیا کہ یا تو میری محبت کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ یا میرا من لینے کی کوشش ہے۔ ہنس کر بات ٹال دی۔ مگر جب گوداوری نے متین انداز سے کہا۔ "تم اسے ہنسی مت سمجھو۔ میں سچے دل سے کہتی ہوں۔ کہ اولاد کا منہ دیکھنے کے لیے میں سوت سے چھاتی پر مونگ دلوانے کے لیے بھی تیار ہوں۔ یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں پُرآب ہو گئیں۔ تب تو پنڈت جی کو کوئی شبہ نہ رہا۔ استنے اعلیٰ اور بے نفس ارادے

سے بھری ہوئی گوداوری کو انہوں نے گلے سے لگالیا اور بولے "مجھ سے یہ نہ ہوگا. مجھے اولاد کی آرزو نہیں" گوداوری نے زور دے کر کہا، "تم کو نہیں مجھے تو ہے اگر اپنی خاطر سے نہیں تو میری خاطر سے یہ کام کرنا پڑے گا"

پنڈت جی سیدھے سادے آدمی تھے۔ حامی تو نہ بھری مگر کچھ نیم راضی سے ہو گئے۔ بس اس کی دیر تھی۔ پنڈت جی کو ذرا بھی تکلیف نہ کرنا پڑی۔ گوداوری کی دانشمندی نے ساری منزل آسان کر دی۔ اس نے صرف اپنے پاس سے روپے ہی نہیں نکالے۔ بلکہ اپنے گہنے کپڑے بھی نذر کر دیئے۔ بدنامی کا خوف اس راستہ میں ایک بڑا زبردست کانٹا تھا۔ دیودت جی یہ سوچتے کہ جب میں سر پہ مور سجا کر موچھیں کٹوائے۔ دولہا بنا ہوا نکلوں گا۔ تو لوگ مجھے کیا کہیں گے۔ میرے دفتر کے لوگ مضحکہ اڑائیں گے۔ اور میری طرف مسکراتی ہوئی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ ان کی یہ نگاہیں چھرے سے بھی زیادہ تیز ہوں گی۔ اس وقت کہاں منہ چھپاؤں گا؟ مگر گوداوری نے اپنے گاؤں میں جاکر اس کام کو چھیڑا۔ اور بخیریت انجام تک پہنچا دیا۔ نئی بہو گھر میں آگئی۔ اس وقت گوداوری ایسی خوش تھی۔ گویا بیٹے کا بیاہ کر لائی ہے وہ خوب گاتی بجاتی رہی۔ اسے کیا معلوم تھا۔ کہ بہت جلد اس گانے کے بدلے رونا پڑے گا۔

—— ۳ ——

کئی مہینے گزر گئے۔ گوداوری اپنی سوت پر اسی طرح حکومت کرتی تھی۔ گویا وہ اس کی ساس ہے۔ تاہم اسے یہ بات اک دم کے لیے نہ بھولتی تھی۔ کہ میں اصل میں اس کی ساس نہیں ہوں۔ ادھر گھومتی کو بھی اپنی حیثیت کا پورا خیال رہتا تھا۔ اسی لیے گوداوری کی حکومت، ساس کی حکومت کی طرح سخت نہ ہونے کے باوجود

اسے ناقابلِ برداشت معلوم ہوتی۔ اسے اپنی چھوٹی موٹی ضرورتوں کے لیے بھی گوداوری کے سامنے ہاتھ پھیلاتے شرم آتی تھی۔

کچھ دنوں بعد گوداوری کی عادات میں ایک نمایاں فرق نظر آنے لگا۔ وہ پنڈت دیودت کو گھر میں آتے جاتے بڑی تیز متجسس نگاہوں سے دیکھتی۔ اس کی فطری متانت غائب سی ہو گئی۔ ذرا سی بات بھی اس کے پیٹ میں نہیں پچتی جب پنڈت جی دفتر سے آتے ہیں۔ تب گوداوری گھنٹوں ان کے پاس بیٹھی ہوئی گومتی کا ذکرِ خیر کیا کرتی ہے۔ اس داستان میں اکثر ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر ہوتا ہے کہ جب وہ ختم ہو جاتی ہیں۔ تو پنڈت جی کے دل پر سے ایک بوجھ سا اتر جاتا ہے۔ گوداوری کیوں اتنی پرگو ہو گئی تھی۔ اس کا راز سمجھنا مشکل ہے۔ شاید وہ اب گومتی سے ڈرتی تھی۔ ان کے حسن سے، اس کے شباب سے اور اس کی شرمیلی آنکھوں سے، باندھ کر توڑ کر وہ اب پانی کا بہاؤ مٹی کے ڈھیلوں سے روکنا چاہتی ہے۔

ایک دن گوداوری نے گومتی سے میٹھے چاول پکانے کو کہا۔ شاید رکھشا بندھن تھا۔ گومتی نے کہا شکر نہیں ہے۔ گوداوری یہ سن کر متحیر ہو گئی۔ اتنی شکر اتنی جلد کیسے اٹھ گئی۔ جسے چھاتی پھاڑ کر کمانا پڑتا ہے۔ اسے اکھرتا ہے۔ کھانے والے کیا جانیں؟

جب پنڈت جی دفتر سے آئے تو یہ ذرا سی بات ایک طولانی داستان بن کر ان کے کانوں میں پہنچی۔ تھوڑی دیر کے لیے پنڈت جی کو شبہ ہوا۔ کہ کہیں گومتی کو غلبہ اشتہا کا مرض تو نہیں ہو گیا۔

ایسا ہی واقعہ ایک بار پھر ہوا۔ پنڈت جی کو بواسیر کی شکایت تھی۔ لال

مرچ بالکل نہ کھاتے تھے ۔ گوداوری جب کھانا پکاتی تو اس بات کا بڑا خیال رکھتی تھی۔ گومتی نے ایک دن مصالحہ کے ساتھ دال میں تھوڑی سی لال مرچ بھی ڈال دی پنڈت جی نے دال کم کھائی ۔ مگر گوداوری گومتی کے پیچھے پڑ گئی ۔ اینٹھ کر اس سے بولی "ایسی زبان جل کیوں نہیں جاتی ۔

(۴)

پنڈت جی سیدھے سادے آدمی تھے ہی ، دفتر سے آئے ، کھانا کھایا ، پڑ کر سو رہے ۔ وہ ایک ہفتہ وار اخبار منگواتے تھے ۔ مگر اسے کبھی کبھی مہینوں کھولنے کی نوبت نہ آئی تھی ۔ جس کام میں ذرا بھی تکلیف یا تردد ہو ۔ اس سے وہ کوسوں دور بھاگتے تھے ۔ کبھی کبھی ان کے دفتر میں تھیٹر کے پاس مفت ملا کرتے تھے ۔ مگر پنڈت جی ان سے کبھی کام نہ لیتے ۔ اور ہی لوگ مانگ لے جاتے تھے ۔ رام لیلا یا اور کوئی میلا تو شاید نوکری کرنے کے بعد کبھی دیکھا ہی نہیں ۔ گوداوری ان کی عادت سے واقف ہو گئی تھی ۔ پنڈت جی بھی ہر ایک معاملہ میں اسی کی رائے پر چلنے میں اپنی عافیت سمجھتے تھے ۔

پر روئی جیسی ملائم شئے بھی دب کر سخت ہو جاتی ہے ۔ پنڈت جی کو یہ آٹھوں پہر کی دیکھ بھال سخت ناگوار معلوم ہوتی کبھی کبھی وہ من ہی میں جھنجھلانے بھی لگتے ۔ قوت ارادی جو عرصۂ دراز تک بے کار پڑے رہنے سے بالکل مردہ ہو گئی تھی ۔ از سر نو عود کرنے لگی ۔

پنڈت جی یہ مانتے تھے ۔ کہ گوداوری نے سوت کو گھر لانے میں بڑے ایثار سے کام لیا ۔ اس ایثار کو بشریت سے کوئی مناسبت نہیں ۔ لیکن اس کا جو احسان

ہے، مجھ پر ہے۔ گومتی پر اس کا کیا احسان؟ میرے باعث اس سے کیوں اس بے دردی کا برتاؤ کیا جاتا ہے؟ یہاں اسے ایسا کون سا سکھ مل گیا ہے جس کے بدلے میں وہ یہ پھٹکاریں سہے، شوہر ملا ہے، وہ بوڑھا، دائم المرض گھر ملا ہے۔ وہ ایسا کہ آج نوکری چھوٹ جائے تو کل نان شبینہ کا بھی ٹھکانا نہیں۔ ان حالات میں ـــ گوداوری کا ظالمانہ سلوک انہیں بہت ناگوار معلوم ہوتا۔

گوداوری کی آنکھیں اتنی کم بین نہ تھیں کہ پنڈت دیودت کی کیفیات قلب نظر نہ آئیں۔ ان کے دل میں جو خیالات پیدا ہوتے وہ گوداوری کو ان کے چہرہ پر موٹے حروف میں منقوش معلوم ہوتے۔ یہ علم اس کے سینے میں ایک طرف تو گومتی کے خلاف حسد کی آگ بھڑکاتا تھا۔ اور دوسری طرف پنڈت جی پر خود غرضی، بے وفائی اور دغابازی کا الزام عائد کرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا، کہ دل کی کدورت روز بروز بڑھتی ہی گئی۔

(۵)

رفتہ رفتہ گوداوری نے پنڈت جی سے گومتی کا چرچا کرنا ہی چھوڑ دیا۔ گویا اس کے نزدیک گومتی گھر میں تھی ہی نہیں۔ وہ اب نہ اس کے کھانے پینے کی خبر لیتی ہے۔ نہ کپڑے لتے کی، ایک بار کئی دنوں تک اسے اپنے ناشتہ کرنے کو بھی نہ ملا۔ پنڈت جی آرام طلب آدمی تو تھے ہی وہ ان سب بے عنوانیوں کو دیکھتے مگر اپنی عافیت کے سمندر میں تلاطم پیدا ہونے کے خوف سے زبان نہ ہلاتے تھے۔ تاہم یہ آخری بے رحمی ان کے غیر معمولی تحمل و برداشت کے لیے بھی قاتل ثابت ہوئی۔ ایک دن انہوں نے گوداوری سے ڈرتے ڈرتے کہا "کیا آج کل گھر میں ناشتے کے

لیے مٹھائی وٹھائی نہیں آتی۔

گوداوری نے ترش رو ہو کر جواب دیا "تم لاتے ہی نہیں۔ تو آئے کہاں سے، میرا کوئی نوکر بیٹھا ہے"۔

دیودت کے دل پر گوداوری نے ان سے کبھی ایسے لہجہ میں بات چیت نہیں کی تھی۔ بولے آہستہ بولو۔ جھنجھلانے کی تو میں نے کوئی بات نہیں کی۔

گوداوری نے آنکھیں نیچی کر کے کہا۔ مجھے تو جیسا آتا ہے ویسے بولتی ہوں۔ دوسروں کی سی میٹھی چکنی باتیں کہاں سے لاؤں"؟

دیودت نے ذرا گرم ہو کر کہا۔ "آج کل مجھے تمہارے مزاج کا کچھ رنگ ہی نہیں ملتا۔ بات بات پر الجھتی ہو"۔

گوداوری کا چہرہ غصہ کی آگ سے لال پیلا ہو گیا۔ بیٹھی تھی، کھڑی ہو گئی۔ ہونٹ پھڑکنے لگے۔ بولی "اب تمہیں میری کوئی بات اچھی نہ لگے گی۔ اب تو سر سے پیروں تک مجھ میں عیب ہی عیب بھرے ہیں۔ اب اور لوگ تمہاری مرضی کے مطابق کام کریں گے، مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ یہ لو بندوق کی کنجی۔ اپنے روپے پیسے سنبھال لو۔ یہ آئے دن کی جھنجھٹ مجھ سے نہیں برداشت ہو سکتی۔ جب تک نبھا نبھایا، اب نہیں نبھ سکتا۔

پنڈت دیودت کو سکتہ سا ہو گیا۔ جس شور و شر کا انہیں خدشہ تھا۔ اس نے نہایت خوفناک صورت میں ان کے گھر میں قدم رکھا۔ وہ اور کچھ نہ بول سکے اس وقت زیادہ بولنے سے بات بڑھنے کا اندیشہ تھا۔ وہ باہر چلے آئے، سوچنے لگے کہ میں نے گوداوری کے ساتھ ایسی کون سی بے عنوانی کی ہے۔ جس کا یہ پھل مل رہا ہے۔

ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا۔ کہ گوداوری کے ہاتھ سے نکل کر گھر کا انتظام کیونکر ہو سکے گا۔ اس قلیل آمدنی میں وہ نہ جانے کون سا جگت کرتی تھی۔ اب ایشور کیسے پار لگائیں گے۔ کچھ نہیں اسے منانا پڑے گا۔ اور ہو ہی کیا سکتا ہے! گومتی کیا کرے گی؟ سارا بوجھ میرے سر پڑے گا، مانے گی تو مگر مشکل سے۔

مگر پنڈت جی کے یہ خیالات باطل نکلے۔ صندوق کی وہ کنجی زہریلی ناگن کی طرح وہیں آنگن میں تین دن تک پڑی رہتی۔ کسی کو اس کے نزدیک جانے کی جرأت نہ ہوئی۔

چوتھے دن پنڈت جی نے گویا جان پر کھیل کر کنجی اٹھالی۔ اس وقت انہیں ایسا محسوس ہوا۔ گویا کسی نے ان کے سر پر پہاڑ اٹھا کر رکھ دیا ہے۔ آرام طلب آدمیوں کو اپنے مقررہ راستے سے ایک تل بھر ہٹنا بھی دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ پنڈت جی خوب جانتے تھے۔ کہ میں اپنے دفتر کے باعث گھر کا انتظام نہیں کر سکتا تاہم ان سے اتنی ڈھٹائی نہ ہو سکی کہ وہ کنجی گومتی کو دے دیں۔ مگر یہ محض دکھاوا تھا کنجی دیکھنے کو پنڈت جی کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ کام سب گومتی کو کرنا پڑتا تھا اس طرح خاندان پر حکومت کرنے کا آخری وسیلہ بھی گوداوری کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اہل خانہ کے نام کے ساتھ جو عزت اور وقار وابستہ ہوتا ہے۔ وہ بھی اس کنجی کے ساتھ چلا گیا۔ دیکھتے دیکھتے گھر کی مہری، اور پڑوس کی عورتوں کے برتاؤ میں فرق عیاں ہونے لگا۔ گوداوری اب معزول رانی تھی۔ جس کا اختیار صرف دوسروں کی ہمدردی پر رہ گیا تھا۔

(۴)

خانہ داری کے انتظام میں یہ تغیر ہوا۔ تبھی گوداوری کی عادات میں بھی ایک افسوس ناک تغیر آنے لگا۔ حسد دل میں رہنے والی شے نہیں ہے۔ [illegible] میں رات دن اسی خاندان کے چرچے رہتے۔ دیکھو تو دنیا کیسی مطلب [illegible] ہے۔ غریب نے زبردستی دولہا بنایا۔ جان بوجھ کر اپنے پیروں میں کلہاڑی ماری۔ اپنے گہنے کپڑے تک اتار دیے۔ مگر اب روتے روتے آنچل بھیگتا [illegible] تو سوت ہی ہے۔ شوہر نے بھی نظروں سے گرا دیا۔ بس اب لونڈی کی طرح گھر میں پڑی پڑی پیٹ جلایا کرے۔ یہ بھی کوئی جینا ہے؟

گوداوری یہ ہمدردانہ باتیں سنتی اور اس کی آتشِ حسد اور بھی تیز ہوتی۔ اسے اتنا نہ سوجھتا کہ یہ زبانی غمگساریاں زیادہ تر نفسِ انسانی ہی کی خباثت سے پیدا ہوتی ہیں۔

گوداوری کو جس امر کا پورا یقین تھا، اور پنڈت دیودت کو جس کا بڑا خوف تھا۔ وہ بات نہ ہوئی۔ خانہ داری کے معاملات میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہوئی۔ ہاں تجربہ نہ ہونے کے باعث پنڈت جی کے انتظام میں [illegible] خرچ زیادہ پڑ جاتا تھا۔ مگر کام چلا جاتا تھا۔ ہاں گوداوری کو گومتی [illegible] ڈھنگ نظر آتے تھے جس میں آگ ہے۔ مگر آنکھ کی خاصیت ہے [illegible] وہ دل کو بہلانے کے بدلے اور بھی تنگ کر دیتا ہے۔ ایسے بگڑے [illegible] ہو جانے سے گوداوری کو رنج کے بجائے خوشی ہوتی ہے۔ [illegible] کئی دن آفتاب نظر نہ آتا۔ صندوق میں رکھے ہوئے کپڑوں میں [illegible] آگ لگ گئی

تیل کے اچار بگڑ گئے۔ گومتی کو ان چیزوں کو دھوپ میں رکھنے کا خیال نہ رہا۔ گوداوری نے یہ نقصانات دیکھے۔ مگر اسے ذرا بھی افسوس نہ ہوا۔ ہاں دو چار جلی کٹی باتیں سنانے کا موقعہ البتہ ہاتھ آ گیا۔ "مالکن بننا ہی آتا ہے۔ یا مالکن کا کام کرنا بھی؟"

پنڈت دیودت کی عادات میں بھی ایک تبدیلی نظر آنے لگی جب تک گوداوری اپنے حسنِ انتظام سے گھر کا کام کاج سنبھالے ہوئے تھی۔ تب تک انہیں کسی چیز کی کمی نہیں کھلی۔ یہاں تک کہ ترکاری سبزی وغیرہ کے لیے بھی انہیں بازار نہ جانا پڑتا۔ مگر اب گوداوری انہیں دن میں کئی کئی بار بازار جاتے دیکھتی ہے خانہ داری کا انتظام خراب ہونے کے باعث اکثر انہیں عین وقت پر بازار بھاگنا پڑتا ہے۔ گوداوری یہ سب کایا پلٹ دیکھتی۔ اور سنا سنا کے کہتی، یہی مہاراج ہیں۔ کہ ایک تنکا بھی نہ اٹھاتے تھے۔ اب دیکھتی ہوں سارے دن بازار میں ہی کھڑے رہتے ہیں۔ اب یہ کہتے ہوئے کبھی نہیں سنتی کہ میرے لکھنے پڑھنے میں ہرج ہو گا۔

گوداوری کو ایک بار اس کا ثبوت مل چکا تھا۔ کہ پنڈت جی خرید و فروخت کے معاملہ میں بہت ہوشیار نہیں۔ اسی لیے اسے جب کپڑوں کی ضرورت ہوتی، تو وہ اپنے پڑوس کے ایک لالہ صاحب سے منگوایا کرتی تھی۔ پنڈت جی کو یہ بات بھول سی گئی تھی۔ کہ گوداوری کو ساڑیوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے سر سے تو جتنا بوجھ کوئی ہٹا دے۔ اتنا ہی اچھا تھا۔ خود بھی وہی کپڑے پہنتے جو گوداوری منگا کر دے دیتی۔ انہیں نت نئے فیشن اور نمونے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ مگر اب کپڑوں کے لیے بھی انہیں کو بازار جانا ہوتا۔ ایک بار گومتی کے

پاس ساڑیاں نہیں تھیں۔ پنڈت جی بازار گئے تو ایک بہت نفیس جوڑا لائے بزاز نے من مانے دام لیے۔ ادھار سودا لینے میں پنڈت جی کو مطلق پس و پیش نہ ہوتا تھا۔ گومتی نے وہ جوڑا گوداوری کو دکھایا۔ گوداوری نے دیکھا، اور پھر منہ پھیر کر بولی۔ بھلا تم نے انہیں کپڑے لانا تو سکھا دیا۔ مجھے تو سولہ سال گزر گئے۔ ان کے ہاتھ کا لایا ہوا کپڑا اخواب میں پہننا بھی نصیب نہ ہوا۔

ایسے واقعے گوداوری کی آتشِ حسد کو اور بھی زیادہ مشتعل کیا کرتے تھے جب تک اسے یقین تھا کہ پنڈت جی فطرتاً روکھے ہیں۔ تب تک اسے اطمینان تھا۔ مگر اب ان کی یہ نئی نئی امنگیں دیکھ کر اسے معلوم ہوا۔ کہ میں نے ہزار کوشش کرنے پر بھی جس محبت کو نہ پایا۔ اسے گومتی نے محض اپنے حسن سے جیت لیا۔ اُسے اب یقین ہوا کہ میں جسے سچی محبت سمجھتی تھی۔ وہ فی الواقع ابلہ فریبی تھی۔ وہ محبت نہ تھی۔ نری خود غرضی تھی۔

(۷)

اتفاق سے اسی زمانے میں گومتی بیمار پڑی۔ اٹھنے بیٹھنے کی شکست نہ رہی۔ گوداوری کھانا پکانے لگی۔ مگر اسے یقین نہ ہوا کہ گومتی واقعی بیمار ہے وہ سمجھتی تھی کہ مجھ سے کھانا پکوانے کے لیے یہ سوانگ رچا گیا ہے۔ پڑوسنوں سے کہتی کہ لونڈی بننے میں اتنی ہی کسر تھی۔ وہ بھی پوری ہو گئی۔

پنڈت جی کو آج کل کھانا کھاتے وقت بھاگا بھاگ سی پڑ جاتی ہے معلوم نہیں کیوں۔ وہ اکیلے گوداوری سے باتیں کرتے ڈرتے ہیں۔ جانے کیا لعن طعن کرنے لگے۔ اسی لیے کھانا کھاتے وقت وہ ڈرتے رہتے تھے۔ کہ کہیں وہ

منحوس گھڑی نہ آجائے۔ گوداوری اپنی تیز نگاہوں سے ان کی یہ حالت دیکھتی اور دل میں اینٹھ کر رہ جاتی۔ ایک دن اس سے نہ رہا گیا۔ بولی، کیا مجھ سے بولنے کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے۔ دیکھتی ہوں، کہیں تو رات رات بھر باتوں کا تار نہیں ٹوٹتا۔ پر میرے سامنے منہ نہ کھولنے کی بھی قسم کھا لی ہے۔ گھر کا رنگ ڈھنگ، تو دیکھتے ہو نہ۔ اب تو سب کام تمہاری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے!

پنڈت جی نے سر نیچا کیے ہوئے جواب دیا۔ اُنھو جیسے چلتا ہے ویسے چلتا ہے اب اس فکر میں کیا اپنی جان دے دوں؟ جب تم یہی چاہتی ہو۔ کہ گھر مٹی میں مل جائے تو میرا کیا بس ہے۔

اس پر گوداوری نے کچھ سخت باتیں کیں۔ بات بڑھ گئی۔ پنڈت جی اٹھ آئے۔ گوداوری نے قسم دلا کر انھیں بٹھانا چاہا۔ مگر وہ نہ بیٹھے۔ تب اس نے رسوئیں اٹھا دیں۔ سارے گھر کو فاقہ کرنا پڑا۔ گومتی میں ایک خاص صفت یہ تھی کہ بات چاہے کیسی بھی سخت کیوں نہ ہو وہ سہہ لیتی تھی۔ مگر بھوک کی برداشت اس سے نہ ہو سکتی تھی۔ اسی لیے وہ کبھی برت (روزہ) نہ رکھتی تھی۔ ہاں بہت اصرار کرنے سے جنم اشٹمی رکھ لیتی تھی۔ لیکن آج کل بیماری کے باعث اسے اور بھی بھوک لگتی تھی۔ جب اس نے دیکھا، کہ دوپہر ہونے آئی، اور کھانا ملنے کی امید نہیں تو اس نے مجبور ہو کر بازار سے مٹھائی منگوائی۔ ممکن ہے، اس نے محض گوداوری کو جلانے کے لیے یہ حرکت کی ہو۔ کیونکہ کوئی بھی ایک وقت کے بھوکے رہنے سے مر نہیں جاتا گوداوری کے سر سے پیر تک آگ لگ گئی۔ اس نے بھی فوراً مٹھائیاں منگوائیں۔ اور آج کئی برس کے بعد خوب پیٹ بھر کے مٹھائی کھائی۔ یہ سب حسد

کے کرشمے ہیں ۔

جو گوداوری دوپہر ہونے سے پہلے منہ میں پانی ڈالنا گناہ سمجھتی تھی وہی گوداوری اب روزانہ علی الصباح ناشتے کے بغیر بے قرار ہو جاتی ہے ۔ سر میں وہ ہمیشہ میٹھا تیل ڈالتی تھی ۔ اب میٹھے تیل سے سر میں درد ہونے لگتا تھا ۔ پان کھانے کا شوق بھی پیدا ہوا ۔ اسے حسد نے نئی نویلی بہو بنا دیا ۔

جنم اشٹمی کا مبارک دن آیا ۔ پنڈت دیودت کی خلقی محبوبیت ان دو تین دنوں کے لیے رخصت ہو جاتی تھی ۔ وہ بڑے جوش سے اس کی تیاریاں کرتے تھے ۔ گوداوری یہ برت بے آب و دانہ رکھتی تھی ۔ اور پنڈت جی تو کرشن کے بھگت ہی تھے ۔ ان کے لیے بے آب و دانہ رہنا لازمی تھا ۔ ان کے اصرار سے اب کے گومتی نے بھی نرجل برت رکھنے کی جرأت کی ۔ مگر اسے انتہا درجہ متعجب ہوا ۔ جب ہری نے کہا ۔ بڑی بہو برت نہ رکھیں گی ۔ ان کے لیے بازار سے پوریاں منگوا دیتا ۔

شام کے وقت گوداوری نے مان مندر جانے کے لیے یکہ کی فرمائش کی ۔ گومتی کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی ۔ مان مندر بالکل قریب تھا ۔ اب یکے والے سیدھے منہ سے بات نہیں کرتے تھے ۔ وہ چڑھ کر بولی ۔ فضول پیسے پھینکنے سے کیا فائدہ ۔ مان مندر کون بڑی دور ہے ۔ پاؤں پاؤں کیوں نہیں چلی جاتیں ۔ فرمائش کر دینا آسان ہے ۔ کھلتا ہے اس کو جو چھاتی پھاڑ کر کماتا ہے ۔

تین سال پہلے گومتی نے اس طرح کی باتیں گوداوری کے منہ سے سنی تھیں آج گوداوری کو وہی باتیں اس کے منہ سے سننا پڑیں ، دنوں کا پھیر !

گوداوری ان دنوں بڑی بے دلی سے کھانا بناتی تھی ۔ پنڈت جی کے پرہیز کے

متعلق اسے اب پہلے کی سی احتیاط نہ تھی۔ ایک دن اس نے مہری سے کہا، کہ اندر سے مصالحے نکال کر پیش لا۔ مصالحے دال میں پڑے۔ تو دال ذرا تیز ہو گئی، مارے خوف کے پنڈت جی سے نہ کھائی گئی۔ اور آرام طلب آدمیوں کی طرح چٹپٹی چیزیں انہیں بھی مرغوب تھیں۔ لیکن مرض کے ہاتھوں مجبور تھے۔ گومتی نے جب یہ ماجرا سُنا۔ تو بھویں چڑھا کر بولی "کیا بڑھاپے میں زبان گز بھر کی ہو گئی ہے۔" کچھ اس طرح کی سخت باتیں پہلے گوداوری نے بھی کہی تھیں۔ آج اس کی سننے کی باری تھی۔ نیرنگیٔ زمانہ اسی کا نام ہے۔

(۸)

آج گوداوری گنگا سے ملنے آئی ہے۔ تین سال ہوئے، وہ ایک بار دولہا دُلہن کو لے کر گنگا کو دودھ چڑھانے آئی تھی۔ آج وہ اپنی جان اُسے نذر کرنے آئی ہے۔ آج وہ اس کی مسرت بار موجوں میں آرام کرنا چاہتی ہے۔

گوداوری کو اس گھر میں ایک ایک لمحہ رہنا شاق تھا جس گھر میں لونڈی بن کر رہنا اس جیسی خوددار عورت کے لیے محال تھا۔

اب اس گھر سے گوداوری کا تعلق صرف اس پرانی رسی کی طرح تھا۔ جو بار بار گرہ دینے پر بھی کہیں نہ کہیں سے ٹوٹ ہی جاتی ہے۔ اسے گنگا جی کے دامن میں پناہ لینے کے سوا اور کوئی تدبیر نہ نظر آتی تھی۔

کئی دن ہوئے اس کے منہ سے بار بار جان دے دینے کی دھمکی سن کر پنڈت جی غصے سے بول اُٹھے تھے۔ تم کسی طرح مر بھی تو جاتیں۔ گوداوری وہ زہریلے الفاظ اب تک نہ بھولی تھی یہ چبھنے والی باتیں اس کے دل پر پتھر کی لکیر بن جاتی تھیں۔ آج

گومتی نے بھی ویسی باتیں کہیں۔ اگرچہ اس نے بہت کچھ سننے پر یہ الفاظ زبان سے نکالے تھے۔ مگر گوداوری کو اپنی باتیں تو بھول گئی تھیں۔ صرف گومتی کی باتیں کان میں گونج رہی تھیں۔ آہ! اور پنڈت جی نے اسے ڈانٹا تک نہیں۔ مجھ پر ایسا غضب ڈھایا جائے۔ اور وہ زبان تک نہ کھولیں۔

آج سب لوگوں کے چلے جانے پر گوداوری گھر سے باہر نکلی۔ آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ پانی کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ رہی تھی۔

محبت کی زنجیر کتنی مضبوط ہے۔ اور پھر کتنی نازک ہے! نازک ہے۔ دغا کے سامنے مضبوط ہے۔ بیوگ کے سامنے، گوداوری چوکھٹ پر کھڑی گھنٹوں روتی رہی۔ کتنی ہی پچھلی باتیں اسے یاد آتی تھیں۔ کبھی اسی گھر میں اس کے لیے محبت بھی تھی عزت بھی تھی۔ زندگی کا سکھ بھی تھا۔ مگر اب کیا ہے! فوراً پنڈت جی کی وہ دل خراش باتیں یاد آگئیں۔ آنکھوں سے پھر آنسو جاری ہو گئے۔ گوداوری گھر سے چل کھڑی ہوئی۔

اس وقت اگر پنڈت دیودت ننگے سر، ننگے پاؤں، پانی میں بھیگتے، دوڑتے آتے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گوداوری کو پکڑ کر اپنے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگا لیتے اور کہتے "پیاری" اس کے سوا ان کی زبان سے اور کچھ نہ نکلتا۔ کیا تب بھی گوداوری اپنے ارادے پر قائم رہتی؟

کنوار کا مہینہ تھا۔ رات کو گنگا کی لہروں کی گرج بہت خوف ناک معلوم ہوتی ساتھ ہی یکایک بجلی کوند جاتی، تو اچھلتی ہوئی لہریں روشنی میں ایسی معلوم ہوتیں گویا روشنی خود مست ہاتھیوں کے جسم میں کلیلیں کر رہی ہے۔ نزاع ہستی کا ایک

خوفناک منظر آنکھوں کے سامنے پھیلا ہُوا تھا۔

گوداوری کے سینے میں بھی اس وقت خیالات کی پُرشور لہریں اٹھتی تھیں۔ اور آپس میں ٹکراتی تھیں۔ کہاں؟ تاریکی میں جہاں کچھ نہیں تھا۔

کیا یہ گرجتے اٹھنے والی گنگا گوداوری کے دلِ بے قرار کو تسکین دے سکتی ہے؟ اس کی لہروں سے نغمۂ شیریں کی صدائیں نہیں آتیں۔ اس کی آنکھوں میں رحم کی جھلک نہیں ہے۔ وہ اس وقت غضبناک اور پرخروش ہیں۔

گوداوری کنارے پر بیٹھی کیا سوچ رہی تھی۔ کون کہہ سکتا ہے؟ کیا اب بھی اُسے یہ کھٹکا نہیں تھا۔ کہ پنڈت دیودت آتے نہ ہوں؟ پریم کی رسی کتنی مضبوط ہوتی ہے۔

اسی تاریکی میں حسد اور یاس اور بے مہری کے ہاتھوں ستائی ہوئی یہ دُکھیا گنگا کی گود میں گر پڑی۔ لہریں چاروں طرف جھپٹیں، اور اُسے نگل گئیں۔

سویرا ہوا گوداوری گھر میں نہیں تھی۔ اس کی چارپائی پر یہ خط پڑا ہوا تھا۔

"سوامی جی! دنیا میں آپ کے سوا اور میرا کون تھا۔ میں نے اپنا سب کچھ آپ کے سکھ کی نذر کر دیا۔ اب آپ کا سکھ اسی میں ہے۔ کہ میں اس دنیا میں نہ ہوں اسی لیے یہ جان بھی اب آپ کی نذر ہے۔ مجھ سے جو کچھ خطائیں ہوئی ہوں۔ انہیں معاف کیجیے گا۔ ایشور آپ کو سدا سُکھی رکھے"۔ پنڈت جی اس خط کو پڑھتے ہی غش کھا کر گر پڑے۔ گومتی رونے لگی۔ مگر معلوم نہیں کیا سوچ کر؟۔

سرِ پُر غرور

شام ہو گئی تھی۔ میں سر جو ندی کے کنارے اپنے کیمپ میں
بیٹھا ہوا دریا کا لطف اُٹھا رہا تھا کہ میرے فٹ بال نے دبے
پاؤں قریب آکر مجھے سلام کیا۔ گویا وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔
"فٹ بال" کے نام سے جس مخلوق کا ذکر کیا گیا۔ وہ میرا اردلی
تھا۔ اسے صرف ایک نظر دیکھنے سے یقین ہو جاتا تھا کہ یہ نام اس
کے لیے کامل طور پر موزوں ہے۔ وہ سر تا پا ایک انسانی اور
لحمی جرم تھا۔ عرض و طول مساوی۔ اس کا مُدَوَّر شکم جس نے اس
دائرہ کے بنانے میں خاص حصّہ لیا تھا۔ ایک لمبے کمر بند میں لپٹا رہتا
تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ انتہا سے آگے نہ بڑھ جائے جس وقت وہ تیزی

سے چلتا تھا۔ نہیں بلکہ لڑھکتا تھا تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ کوئی فٹ بال ٹھوکر کھا کر لڑھکتا چلا آتا ہے۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
"کیا کہتے ہو؟"
اس پر فٹ بال نے ایسی رونی صورت بنائی۔ گویا کہیں سے پٹ کر آیا ہے اور بولا۔ حضور ابھی تک یہاں رسد کا کوئی انتظام نہیں ہوا۔ زمیندار صاحب کہتے ہیں کہ میں کسی کا نوکر نہیں ہوں۔
میں نے اس نگاہ سے دیکھا۔ گویا میں اور زیادہ نہیں سننا چاہتا غیر ممکن تھا کہ ایک مجسٹریٹ کی شان میں زمیندار سے ایسی گستاخی سرزد ہوتی۔ یہ میرے حاکمانہ غصّے کو مشتعل کرنے کی ایک بے تمیزانہ کوشش تھی۔ میں نے پوچھا۔ "زمیندار کون ہے؟"
فٹ بال کی باچھیں کھل گئیں۔ بولا۔ "کنور سجن سنگھ۔ حضور بڑا سرکش آدمی ہے۔ رات ہونے آئی ہے اور ابھی تک حضور کے سلام کو بھی نہیں آیا۔ گھوڑوں کے سامنے نہ گھاس ہے۔ نہ دانہ لشکر کے سب آدمی بھوکے بیٹھے ہیں۔ مٹی کا ایک برتن بھی نہیں بھیجا۔
مجھے زمینداروں سے رات دن سابقہ رہتا تھا۔ مگر یہ شکایت کبھی سننے میں نہیں آئی تھی۔ اس کے برعکس وہ میری خاطر و تواضع میں ایسی جانفشانی سے کام لیتے تھے۔ جو خودداری کے شایاں نہ تھی اس میں فیاضانہ مہمان نوازی کا شائبہ بھی نہ تھا۔ نہ اس میں تکلف تھا

نہ نمودِ ثمر دث . جو عیب ہے مگر سفلہ پن سے خالی ۔ اس کے بجائے
وہاں رسوخ بیجا کی فکر اور خود مطلبی کی ہوس صاف نظر آتی تھی اور
اس رسوخ طلبی کی قیمت شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ ان بے نواؤں سے
وصول کی جاتی تھی جن کا بیکسی کے سوا اور کوئی دستگیر نہیں ۔ ان کے
طرزِ کلام اور آداب میں وہ ملائمت اور عاجزی برتی جاتی تھی جن کا
اعتبار حسنِ ظن کے ساتھ بئیر ہے اور اکثر ایسے موقعے آتے تھے
جب ان خاطر داریوں سے تنگ ہو کر دل چاہتا تھا کہ کاش ان حریصی
اور خوشامدی آدمیوں کی صورت نہ دیکھنا پڑتی ۔

مگر آج اپنے فٹ بال کی زبان سے یہ کیفیت سُن کر میری جو
حالت ہوئی اس نے ثابت کر دیا کہ روزانہ خاطر داریاں اور شیریں
کلامیاں مجھ پر بے اثر نہیں ہوئی تھیں ۔ میں یہ حکم دینے ہی والا تھا ۔
کہ کنور سجن سنگھ کو حاضر کرو کہ دفعتاً مجھے خیال آیا ۔ ان مفت خورے
چپڑاسیوں کے کہنے پر ایک معزز آدمی کو مطعون کرنا قرین انصاف
نہیں ۔ اردلی سے کہا ۔ بنیوں کے پاس جاؤ نقد دام دے کر چیزیں
لاؤ اور یاد رکھو کہ میرے پاس کوئی شکایت نہ آئے ۔

اردلی دل میں مجھے نفریں کرتا ہوا چلا گیا ۔

مگر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی ۔ جب وہاں ایک ہفتہ
تک مقیم رہنے پر بھی مجھے کنور صاحب سے نیاز نہ حاصل ہوا ۔ اپنے
عملوں اور لشکر والوں کی زبان سے کنور صاحب کی سرکشی اور غرور اور

ہیکٹری کی داستانیں روز سُنا کرتا اور میرے جہاندیدہ پیشکار نے ایسے نامہمان نواز گاؤں میں پڑاؤ ڈالنے کے لیے مجھے کئی بار کنایۃً فہمائش کی۔ غالباً میں پہلا شخص تھا جس سے یہ خطا سرزد ہوئی تھی اور اگر میں نے ضلع کے نقشے کے بجائے لشکر والوں سے اپنے دورہ کا پروگرام بنانے میں مدد لی ہوتی تو شاید اس ناگوار تجربہ کی نوبت نہ آتی لیکن کچھ عجب بات تھی کہ کنور صاحب کی مذمت مجھ پر الٹا اثر ڈالتی تھی۔ یہاں تک کہ مجھے اس شخص سے ملاقات کرنے کا اشتیاق ہوا جو ہمہ گیر اور ہمہ کن افسروں سے اس قدر بے نیاز رہ سکتا ہے۔

(۲)

صبح کا وقت تھا۔ گڈھی میں گیا۔ نیچے سر جو ندی لہریں مار رہی تھی۔ اس پار سا کھو کا جنگل تھا۔ میلوں تک بادامی ریت اس پر خربوزہ اور تربوز کی کیاریاں تھیں۔ زرد پھولوں سے لہراتی ہوئی ٹیگلوں اور مرغابیوں کے غول بیٹھے ہوئے تھے۔ سورج دیوتا نے جنگلوں سے سر نکالا۔ لہریں جگمگائیں۔ پانی میں تارے نکلے۔ سہانا روح افزا منظر تھا۔

میں نے اطلاع کی اور کنور صاحب کے دیوان خانہ میں داخل ہوا وسیع کمرہ تھا۔ فرش سے آراستہ۔ سامنے مسند پر ایک نہایت قوی ہیکل شخص بیٹھا ہوا تھا۔ سر کے بال منڈے ہوئے گلے میں رودراکش کی ایک مالا۔ سرخ آنکھیں۔ اونچی پیشانی مردانہ غرور کی اس سے بہتر تصویر نہیں

ہو سکتی۔ چہرہ سے ہیبت اور رعب برستا تھا۔

کنور صاحب نے میرے سلام کو اس انداز سے لیا۔ گویا وہ اس کے عادی ہیں۔ مسند سے اٹھ کر انہوں نے نہایت مربیانہ انداز سے مجھ سے مصافحہ کیا۔ خیریت پوچھی۔ اور اس تکلیف کے لیے میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد عطر پان کی تواضع کی۔ تب وہ مجھے اپنی گڑھی کی سیر کرانے چلے جس نے کسی زمانہ میں ضرور آصف الدولہ کو زچ کیا ہوگا۔ مگر اس وقت شکستہ حال تھی۔ یہاں کے ایک ایک روڑے پر کنور صاحب کو ناز تھا۔ ان کی خاندانی عظمت اور اقتدار کا تذکرہ۔ ان کی زبان سے سن کر باور نہ کرنا غیر ممکن تھا۔ ان کا طرز بیان یقین کو مجبور کرتا تھا اور وہ ان روایات کے محض پاسبان ہی نہ تھے بلکہ یہ ان کے ایمان کا جزو تھیں اور جس قدر ان کے امکان میں تھا۔ انہوں نے اپنی آن نبھانے میں کبھی فروگذاشت نہیں کی۔

کنور سجن سنگھ خاندانی ٹھکر تھے ان کا سلسلہ نسب جا بجا ٹوٹتا ہوا آخر کسی مہا نمار رشی سے مل جاتا تھا۔ گو انہیں اب عبادت و ریاضت کا دعوے نہ تھا لیکن اس کا فخر ضرور تھا کہ وہ ایک رشی کی اولاد ہیں۔ بزرگوں کے جنگی کارنامے بھی ان کے لیے کچھ کم باعث فخر نہ تھے۔ ان کا تاریخ میں کہیں ذکر نہ ہو مگر خاندانی بھاٹ نے انہیں امر بنانے میں کوئی کسر نہیں رکھی تھی اور اگر الفاظ میں کچھ طاقت ہے تو یہ گڑھی رد ہتاس یا کالنجر کے قلعوں پر بھی سبقت رکھتی تھی۔

کم سے کم قدامت اور پامالی کی ظاہری علامتوں میں تو اس کی مثال مشکل سے مل سکتی تھی۔ کیونکہ زمانہ قدیم میں چاہے اس نے محاصروں اور سرنگوں کو حقیر سمجھا ہو۔ لیکن اس وقت وہ چیونٹیوں اور دیمکوں کے حملوں کی بھی مدافعت نہ کر سکتی تھی۔

کنور سجن سنگھ سے میری ملاقات بہت مختصر تھی لیکن اس دلچسپ انسان نے مجھے ہمیشہ کے لیے اپنا گرویدہ بنالیا۔ نہایت ذکی، نکتہ سنج دور رس آدمی تھا جس سے اس کا بندۂ بے درم ہونا تھا۔

(۳)

برسات میں سر جونڈی اسی زور شور سے چڑھی کہ ہزاروں گاؤں غارت ہو گئے۔ بڑے بڑے تناور درخت تنکوں کی طرح بہتے چلے جاتے تھے۔ چارپائیوں پر سوتے ہوئے بچے اور عورتیں۔ کھونٹے پر بندھے ہوئے گائے اور بیل۔ اس کی گرجتی ہوئی لہروں میں سما گئے۔ کھیتوں میں ناؤ چلتی تھی۔

شہر میں اڑتی ہوئی خبریں پہنچیں۔ امداد کے ریزولیشن پاس ہوئے۔ سیکرٹریوں نے ہمدردی اور رنج کے ارجنٹ تار ضلع کے بڑے صاحب کی خدمت میں روانہ کیے۔ ٹاؤن ہال میں قومی ہمدردی کی پُرشور صدائیں بلند ہوئیں اور اس ہنگامے میں ستم رسیدوں کے پُر درد نالے دب گئے۔

سرکار کے کانوں میں فریاد پہنچی۔ ایک تحقیقاتی کمیشن تعینات

کی گئی۔ زمینداروں کو حکم ہوا کہ وہ کمیشن کے روبرو اپنے نقصانات کی تفصیل بیان کریں اور اس کے ثبوت دیں۔ شیو رام پور کے مہاراجہ صاحب کو اس کمیشن کی صدارت کا منصب عطا ہوا۔ زمینداروں میں ریل پیل شروع ہوئی۔ نصیب جاگے۔ نقصان کے تخمینہ کے تصفیہ میں شاعرانہ سخن شناسی سے کام لینا پڑا۔ صبح سے شام تک کمیشن کے روبرو ایک جمگھٹ رہتا تھا۔ آنریبل مہاراجہ صاحب کو سانس لینے کی فرصت نہ تھی۔ دلیل اور شہادت کا کام سخن سازی اور خوشامد سے لیا جاتا تھا۔ مہینوں یہی کیفیت رہی۔ لب ساحل کے سب ہی زمیندار اپنے نقصان کی فردیں پیش کر گئے۔ اگر کوئی کمیشن سے بے فیض رہا تو وہ کنور سجن سنگھ تھے۔ ان کے سارے موضعے سرجو کے کنارے پر تھے اور سب تباہ ہو گئے تھے۔ گڑھی کی دیواریں بھی اس دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکتی تھیں۔ مگر ان کی زبان خوشامد سے ناآشنا تھی۔ اور یہاں اس کے بغیر رسائی مشکل۔ چنانچہ وہ کمیشن کے روبرو صورت سوال بنے ہوئے نہ آسکے۔ میعاد ختم ہونے پر کمیشن نے رپورٹ پیش کی سیلاب میں ڈوبے ہوئے علاقوں میں لگان کی عام معافی ہو گئی۔ رپورٹ کے مطابق صرف سجن سنگھ ہی وہ خوش نصیب زمیندار تھے جن کا کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ کنور صاحب نے رپورٹ سنی مگر پیشانی پر بل نہ آیا۔ اُن کے آسامی گڑھی کے صحن میں جمع تھے۔ یہ حکم سنا تو آہ وزاری کرنے لگے۔ تب کنور صاحب اٹھے اور بلند آواز سے بولے "میرے

علاقے میں بھی معافی ہے۔ ایک کوڑی لگان نہ لیا جائے گا"۔ میں نے یہ واقعہ سُنا اور خود بخود میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ بے شک یہ وہ شخص ہے جو حکومت اور اختیار کے طوفان میں جڑ سے اُکھڑ جائے۔ مگر ختم نہ ہو گا۔

(۴)

وہ دن بھی یادگار رہے گا۔ جب امجد دھیا میں ہمارے جادو نگار زندہ جاوید ٹیگور کو قوم کی جانب سے سپاسنامہ پیش کرنے کیلئے عظیم الشان جلسہ ہوا۔ ہمارا مایۂ ناز۔ ہمارا پُرجوش۔ نازک بیان ٹیگور یورپ اور امریکہ پر اپنے کلام کا جادو کر کے واپس آیا تھا۔ اپنے کمالات پر ناز کرنے والے یورپ نے اس کی پرستش کی تھی۔ اس کے جذبات نے براؤننگ اور شیلے کے عاشقوں کو بھی پابند وفا نہ رہنے دیا۔ اُس کے آب حیات سے تشنہ کامان یورپ سیراب ہو گئے۔ ساری مہذب دنیا نے اس کی پرواز بلند کے آگے سر جھکا دیئے۔ اس نے بھارت کو یورپ کی نگاہوں میں اگر زیادہ نہیں تو یونان اور روم کے پہلو میں بٹھا دیا تھا۔

جب تک وہ یورپ میں رہا روزانہ اخبارات کے صفحات اُس کے تذکروں سے پُر ہوتے تھے۔ یونیورسٹیوں اور علماء کی انجمنوں نے اس پر خطابات کی موسلادھار بارش کر دی تھی۔ وہ نغمۂ انتخاب جو اہل یورپ کا پیارا خواب اور زندہ آرزو ہے۔ وہی نغمہ ہمارے پیارے

زندہ کن تشنگی کے سینہ پر زیب دے رہا تھا اور اس کی واپسی کے بعد آج انہیں قومی خدمات پر اظہار عقیدت کے لیے ہندوستان کے دل اور دماغ اجودھیا میں جمع تھے۔

اسی اجودھیا کی گود میں سرکار رام چندر کھیلے تھے اور یہیں انہوں نے والمیک کی سحر نگاریوں کی داد دی تھی۔ اسی اجودھیا میں ہم اپنے شیریں کلام تشنگی پر اپنی محبت کے پھول چڑھانے آئے تھے۔

اس قومی فرض میں حکام سرکاری بھی نہایت فیاضی کے ساتھ ہمارے شریک تھے۔ تشنگی نے شملہ اور دارجیلنگ کے فرشتوں کو بھی اجودھیا میں کھینچ لیا تھا۔ اجودھیا کو بہت انتظار کے بعد یہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔

جس وقت تشنگی نے وسیع شامیانہ میں قدم رکھا۔ ہمارے دل قومی فخر اور انشراح سے متوالے ہو گئے۔ اس سے محسوس ہوتا تھا کہ ہم اس وقت کسی زیادہ پاک، زیادہ روشن دنیا کے بسنے والے ہیں۔ ایک لمحہ کے لیے۔ افسوس صرف ایک لمحہ کے لیے۔ اپنی پستی اور بیچارگی کا خیال ہمارے دلوں سے دور ہو گیا۔ اچھے لیڈر کی آواز لوگوں کے دلوں کو اس طرح مست کر دیا جیسے مہور ناگ کو مست کر دیتا ہے۔

ایڈریس پڑھے جانے کا نمبر پیچھے ہوا تھا۔ سارے پنڈال میں خاموشی کا عالم طاری تھا۔ جس وقت میر کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔
"اے قوم کے رہنما! اسے ہمارے روحانی گرو! ہم تیری محبت سے

تمہیں مبارک باد دیتے ہیں۔ اور سچی ارادت سے تمہارے قدموں پر
سر جھکاتے ہیں۔۔۔۔۔" یکایک میری نگاہ اٹھی اور میں نے ایک
قوی ہیکل آدمی کو تعلقہ داروں کی صف سے اٹھ کر باہر جاتے دیکھا
یہ کنور سجن تھے۔

مجھے کنور صاحب کی یہ بے موقع حرکت جسے بد تہذیبی خیال کرنے
میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ بُری معلوم ہوئی۔ ہزاروں آنکھیں ان
کی طرف حیرت سے اُٹھیں۔

جلسے کے ختم ہوتے ہی میں نے پہلا کام جو کیا۔ وہ کنور صاحب سے
اس امر کے متعلق جواب طلب کرنا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "کیوں صاحب! آپ کے پاس اس بے
موقع فعل کا کیا جواب ہے"؟

سجن سنگھ نے متانت سے جواب دیا۔ "آپ سننا چاہیں تو
دوں۔"

"شوق سے فرمایئے"۔

"اچھا تو سنئے۔" میں تشکر کے کلام کا دلدادہ ہوں۔ تشکر کی عزت
کرتا ہوں۔ تشکر پر ناز کرتا ہوں۔ تشکر کو اپنا اور اپنی قوم کا محسن
سمجھتا ہوں۔ مگر اس کے ساتھ ہی انہیں اپنا روحانی گورو ماننے
یا ان کے قدموں پر سر جھکانے کے لیے تیار نہیں ہوں"

میں حیرت سے ان کا منہ تکتا رہ گیا۔ یہ انسان نہیں غرور کا

پتلا ہے۔ دیکھیں یہ سر کبھی جھکتا ہے یا نہیں۔

(۵)

پورنماشی کا پورا چاند سرجو کے سنہرے فرش پر ناچتا تھا اور لہریں خوشی سے گلے مل مل کر گاتی تھیں۔ یہ پھاگن کا مہینہ تھا۔ پیڑوں میں کونپلیں نکلی تھیں اور کوئل کوکنے لگی تھی۔

میں اپنا دورہ ختم کر کے صدر لوٹتا تھا۔ راستہ میں کنور سجن سنگھ کے فیض صحبت کا اشتیاق مجھے ان کے در دولت تک لے گیا جو اب میرے لیے خانہ بے تکلف تھا۔

میں شام کے دریا کی سیر کو چلا۔ وہ ہوائے جاں پرور وہ درخشاں لہریں۔ وہ روحانی سکوت۔ سارا منظر ایک دلآویز پر مزہ خواب تھا۔ چاند کے نغمہ درخشاں سے جس طرح لہریں جھوم رہی تھیں۔ اسی طرح فکر شیریں سے دل امڈ آتا تھا۔

مجھے اونچے کراڑے پر ایک درخت کے نیچے کچھ روشنی نظر آئی۔ میں اوپر چڑھا۔ وہاں برگد کے گھنے سایہ میں ایک دھونی جل رہی تھی۔ اس کے سامنے ایک سادھو پیر پھیلائے۔ برگد کی ایک موٹی جٹا کے سہارے لیے ہوئے تھے۔ ان کا نورانی چہرہ آگ کی چمک کو لجاتا تھا۔ نیلے تالاب میں کنول کھلا ہوا تھا۔

ان کے پیروں کے پاس ایک دوسرا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ وہ اس سادھو کے پیروں پر اپنا سر رکھے

ہوئے تھا۔ قدموں کو چومتا تھا اور آنکھوں سے لگاتا تھا۔ سادھو اپنے دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھے ہوئے تھے۔ گویا ہوس صبر اور قناعت کے دامن میں پناہ ڈھونڈتی تھی۔ بھولا لڑکا ماں باپ کی گود میں آ بیٹھا تھا۔

دفعتہً وہ سر پرُخم اُٹھا اور میری نگاہ اس کے چہرے پر پڑی مجھے سکتا سا ہو گیا۔ یہ کنور سجن سنگھ تھے۔ وہ سر جو خم ہونا نہ جانتا تھا۔ اس وقت زمین بوس تھا۔

وہ ہاتھ جو ایک اعلیٰ منصب دار کے سامنے نہ جھکا جو ایک باثروت اور با اختیار مہاراجہ کے سامنے نہ جھکا۔ جو ایک باکمال قوم پرست شاعر اور فلاسفر کے سامنے نہ جھکا۔ اس وقت ایک سادھو کے قدموں پر گرا ہوا تھا۔ غرور۔ ترک اور استغناء کے سامنے سرنگوں ہو گیا تھا۔

میرے دل میں اس عبرتناک نظارہ سے عقیدت کا ایک ولولہ پیدا ہوا۔ آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹا اور کنور سجن سنگھ کا روحانی مرتبہ دکھائی دیا۔ میں کنور صاحب کی طرف چلا۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھانا چاہا لیکن میں ان کے پیروں سے لپٹ گیا اور بولا "میرے دوست! میں آج تک تمہاری روحانی عظمت سے بالکل بے خبر تھا۔ آج تم نے میرے دل پر نقش کر دیا کہ جاہ اور ثروت۔ کمال اور شہرت یہ سب سفلی اور مادی ہیں یا نفس کے ناز بردار اس قابل نہیں کہ ہم ان کے سامنے فرق نیاز جھکائیں۔

ترک اور تسلیم ہی وہ علوی صفات ہیں جن کے آستانہ پر حشمت اور جاہ سے بے نیاز سر بھی جھک جاتے ہیں۔ یہی وہ طاقت ہے جو جاہ و حشم کو بادۂ غرور کے متوالوں کو اور تاج مرصع کو اپنے قدموں پر گرا سکتی ہے۔ اے کنج خلوت میں بیٹھنے والی روحو! کہ تم دفینہ ہو کہ غرور کے پتلے بھی تمہارے پیروں کی دھول کو ماتھے پر چڑھاتے ہیں۔

کنور سجن سنگھ نے مجھے چھاتی سے لگا کر کہا "مسٹر واگلے آج آپ نے مجھے سچے غرور کی صورت دکھادی اور میں کہہ سکتا ہوں کہ سچا غرور سچی عبادت سے کم نہیں۔ یقین مانیے مجھے اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غرور میں بھی روحانیت کا باس ہو سکتا ہے۔ آج میرے سر میں غرور کا جو نشہ ہے وہ کبھی نہیں تھا۔

اصلاح

ڈرگا مالی ڈاکٹر عرفان علی بار ایٹ لا کے یہاں نوکر تھا۔ پانچ روپیہ تنخواہ تھی۔ گھر میں بیوی کے علاوہ دو تین چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ بیوی پڑوسیوں کے لیے گیہوں پیس دیا کرتی تھی۔ دو بچے جو ذرا ذی شعور تھے۔ اِدھر اُدھر سے لکڑیاں اُپلے وغیرہ چن لاتے تھے۔ مگر تاہم ان کی بڑی تکلیف سے بسر ہوتی تھی۔ درگا ڈاکٹر صاحب کی نظر بچا کر باغیچہ سے پھول چن لیا کرتا۔ اور بازار میں پجاریوں کے ہاتھ بیچ دیتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا دستِ غنیمت پھلوں پر بھی جا پڑتا تھا۔ یہ اس کی بالائی آمدنی تھی۔ اس سے روزانہ نمک تیل کا خرچ نکل آتا تھا۔ اس نے کئی بار ڈاکٹر صاحب سے اضافہ تنخواہ کی التجا کی تھی۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں اضافہ کی کوئی معقول وجہ نہ آتی تھی۔ وہ صاف کہہ دیا کرتے تھے۔ بھئی میں تمہیں جبراً تو نہیں روکتا۔ تمہارا یہاں نباہ نہیں ہوتا۔ کہیں اور

تلاش کرو۔ میرے لیے مایوسی کا محل نہیں ہے۔ دُرگا میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ لگا ہوا روزگار چھوڑ کر دوسری نوکری ڈھونڈنے نکلتا۔ اس سے زیادہ تنخواہ ملنے کی اسے امید بھی کم تھی۔ اس لیے درویش برجانِ درویش پڑا دن کاٹتا تھا۔ اور اپنی تقدیر کو روتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کو باغبانی کا خاص ذوق تھا۔ انواع و اقسام کے پھول پتے لگا رکھے تھے۔ اچھے اچھے پھلوں کے درخت ملیح آباد، سہارنپور، دربھنگہ وغیرہ مقامات سے منگوا کر لگائے تھے۔ درختوں کو پھل سے لدا ہوا دیکھ کر انہیں دلی مسرت ہوتی تھی۔ اپنے احباب کے یہاں اکثر گلدستے اور سبزیاں وغیرہ تحفۃً بھجواتے رہتے تھے۔ انہیں خود کھلانے کا شوق نہ تھا۔ مگر کھلانے میں دوستوں کی دعوت اختیار کرتے۔ پکنک پارٹیاں ان کے مشغلۂ تفریح کا ایک خاص جزو تھیں۔

ایک بار گرمیوں میں انہوں نے اپنے کئی اہم مشرب دوستوں کو آم کی دعوت دی۔ ایک ملیح آبادی سفیدے میں کئی پھل لگے ہوئے تھے۔ انہیں وہ روزانہ چہل قدمی کرتے وقت دیکھا کرتے تھے۔ اس خیال سے انہیں وہی خوشی ہوتی تھی۔ جو کسی پہلوان کو اپنے پٹھوں کے کرتب دکھانے سے ہوتی ہے۔ اتنے بڑے خوش رنگ پھل خود ان کی نگاہ سے کبھی نہ گزرتے تھے۔ پھلوں کی شیرینی کا انہیں اتنا کامل یقین تھا۔ کہ وہ چکھ کر اپنا اطمینان کرنا ضروری نہ سمجھتے تھے۔ بالخصوص اس لیے کہ اس خود پروری سے وہ اپنے کسی ایک دوست کو لطف ذائقہ سے محروم کر دیں گے۔

شام کا وقت تھا۔ چیت کا مہینہ۔ احباب باغیچہ میں آ کر حوض کے کنارے کرسیوں پر بیٹھے، برف اور دودھ کا انتظام پہلے ہی سے کر لیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب پہلے

پھلوں کو درخت میں لگے ہوئے دکھلا کر تب انہیں تڑوانا چاہتے تھے۔ تاکہ کسی کو یہ شک کرنے کا موقع نہ ملے کہ پھل اس باغ کے نہیں ہیں۔ جب سب حضرات جمع ہو گئے۔ تو انہوں نے کہا "آپ لوگوں کو تکلیف تو ہو گی۔ مگر ذرا چل کر پھلوں کو درخت میں لٹکے ہوئے ملاحظہ فرمائیے۔ کتنے خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ گلاب میں بھی ایسی دلآویز سرخی نہ ہو گی۔ رنگ سے ملاحت ٹپکی پڑتی ہے۔ ان کی رنگت اور صورت اس درجہ سے رغبت انگیز ہے۔ کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ میں نے یہ قلم خاص ملیح آباد سے منگوایا تھا۔ اور اس کی خاص طور پر نگہداشت کی گئی ہے۔

احباب اٹھے۔ ڈاکٹر صاحب میزبان کی حیثیت سے آگے آگے چلے۔ روشوں کی دونوں طرف گلاب کے تختے تھے۔ ان کی بہار دکھلاتے ہوئے وہ بالآخر سفیدہ کے درخت کے سامنے آ گئے۔ مگر وہاں ایک پھل بھی نہ تھا۔ انہوں نے خیال کیا۔ شاید یہ درخت نہیں ہے۔ دو قدم اور آگے چلے۔ دوسرا درخت مل گیا اور آگے بڑھے۔ کٹھل کا درخت آ گیا۔ پھر پیچھے لوٹے۔ اور تعجب کرتے ہوئے سفیدہ کے درخت کے سامنے ٹک گئے۔ پھل کیا ہوئے؟ درخت تو یہی ہے۔ اس میں مطلق شبہ نہیں۔ مگر پھل کہاں گئے؟ دوستوں کی طرف خطا وارانہ انداز سے دیکھا اور معافی طلب لہجے میں بولے "ضرور مالی کی شرارت ہے۔ دیکھئے میں کم بخت کو ابھی بلاتا ہوں۔ میں حد درجہ نادم ہوں۔ کہ آپ صاحبوں کو ناحق تکلیف ہوئی۔ واللہ مجھے اس وقت جتنا ملال ہے۔ اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔ ایسے خوش ذائقہ، خوش رنگ، خوشنما پھل میں نے اپنی

زندگی میں نہ دیکھے تھے۔ ان کے یوں تلف ہوتے کا مجھے بے انتہا قلق ہے۔"
یہ کہتے ہوئے وہ ایک انداز شہادت سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ احباب نے کہا "جناب آپ ہم لوگوں کی تکلیف کا خیال نہ فرمائیں، وہ نہ سہی۔ دوسرے پھل سہی۔" ایک رنگین طبع صاحب بولے۔ جناب مجھے تو سب آم ایک ہی سے لگتے تھے۔ سفیدے، موہن بھوگ، لنگڑے، بمبئی فجری، دسہری اس میں کوئی فرق معلوم ہوتا۔ معلوم نہیں کیونکر آپ لوگوں کو ان کی لذتوں میں امتیاز معلوم ہوتا ہے۔

دوسرے صاحب نے فرمایا "یہاں بھی وہی کیفیت ہے۔ اس وقت جو موجود ہوں۔ وہی منگوا یئے۔ جو گئے ان کا افسوس بے سود ہے۔"

عرفان علی حضرت آم کی کیا کمی ہے سارا باغ بھرا ہوا ہے۔ خوب شوق سے کھایئے۔ مگر وہ لطافت اور نزاکت کہاں؟ آپ کو یقین نہ آئے گا۔ وہ ان سفیدوں پر ایسا نکھار تھا۔ کہ بالکل سیب معلوم ہوتے تھے۔ سیب خوشنما ضرور معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس میں وہ رغبت انگیز لطافت کہاں؟ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ شجر آرزو میں وصال کے پھل لگے ہوئے ہیں۔ واللہ سخت افسوس ہے، کمال افسوس ہے۔ اس مالی نے آج وہ حرکت کی ہے کہ جی چاہتا ہے۔ نمک حرام کو گولی مار دوں۔ اس وقت سامنے آجائے تو ادھ موا کر دوں، (مسکرا کر) اگر خدانخواستہ کل مجھ پر ضرب شدید کا کوئی استغاثہ ہو تو آپ لوگ شاہد رہیئے گا۔ کہ مجھے کس قدر روحانی اشتعال ہوا ہے۔

مالی کا پتہ نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے سائیس سے آم تڑوائے، دوستوں نے

آم کھائے۔ دودھ پیا۔ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کر کے اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔ انہیں ڈاکٹر صاحب کے نقصانِ عظیم کا مطلق احساس نہ ہوا۔ مگر ڈاکٹر صاحب وہیں حوض کے کنارے ڈنڈا ہاتھ میں لیے مالی کے انتظار میں قطب از جانے جنبد بنے بیٹھے رہے

(۲)

دُرگا شام کو بازار سے لوٹا۔ وہ چوکنی نظروں سے اِدھر اُدھر تاکتا آتا تھا۔ جونہی اس نے ڈاکٹر کو حوض کے کنارے ڈنڈا ہاتھ میں لیے بیٹھے دیکھا۔ اس کے ہوش اڑ گئے۔ سمجھ گیا، کہ چوری پکڑ لی گئی۔ اس خوف سے آج اس نے آنے میں عمداً دیر کی تھی اس نے سمجھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کہیں سیر کرنے گئے ہوں گے۔ میں کٹھل کے درخت کے نیچے اپنے جھونپڑے میں جا بیٹھوں گا۔ صبح کو پوچھ پاچھ ہوئی بھی تو مجھے صفائی دینے کا موقع رہے گا۔ سرکار میری تلاشی لے لیں۔ اس طرح معاملہ دب جائے گا۔ چور وقت کو اپنی بریّت کی بہترین دلیل سمجھتا ہے۔ ایک ایک لمحہ اسے دلیر بناتا جاتا ہے۔ لیکن رنگے ہوئے ہاتھوں پکڑے جانا اس کے لیے قہر ہے۔ وہ بے زبان ہو جاتا ہے۔ اس کی سینہ زوری سلب ہو جاتی ہے۔ خون کے سوکھے رنگ کے داغ بن سکتے ہیں لیکن تازہ خون آپ ہی آپ پکارتا ہے۔ دُرگا کے پیر تھم گئے۔ سینہ دھڑکنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب کی نگاہ اس پر پڑ گئی تھی۔ اب واپسی کا ارادہ بے کار تھا۔ ڈاکٹر صاحب دور سے دیکھتے ہی اٹھے۔ کہ چل کر خوب مرمّت کروں لیکن بیرسٹر تھے۔ خیال آ گیا کہ اس کا بیان لینا ضروری ہے۔ اشارہ سے قریب بلایا۔ اور پوچھا، سفیدہ میں کئی پھل لگے ہوئے تھے۔ ان میں ایک بھی نظر نہیں آتا، کیا ہوئے؟ درگا نے معصومانہ انداز سے دیکھ کر کہا۔ "ہجور ابھی بجار گیا ہوں تو آم جوں کے توں تھے۔ اتنی دیر میں کوئی

توڑ لے گیا ہو تو میں نہیں کہہ سکتا۔

عرفان علی۔ تمہارا کس پر شبہ ہے؟

مالی۔ حضور! میں کیسے بتاؤں؟ اتنے نوکر چاکر ہیں۔ نہ جانے کس کی نیت بگڑی ہو۔

عرفان علی۔ مگر میرا شبہ تمہارے ہی اوپر ہے۔ اگر توڑ کر رکھے ہوں تو لا کر دے دو۔ یا صاف صاف کہہ دو۔ کہ میں نے توڑے ہیں۔ ورنہ میں بری طرح پیش آؤں گا۔

چور محض سزا سے نہیں بچنا چاہتا۔ وہ بدنامی سے بھی بچنا چاہتا ہے۔ وہ سزا سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا بدنامی سے۔ جب اسے سزا سے بچنے کی ساری امید منقطع ہو جاتی ہے۔ اس وقت بھی وہ اپنے جرم کا اقبال نہیں کرتا۔ درگا اس وقت اپنے فعل کا اعتراف کر کے سزا سے بچ سکتا تھا۔ پر اس نے کہا، حضور مالک ہیں جو چاہیں کریں پر میں نے آم نہیں توڑے۔ سرکار ہی بتا دیں۔ کہ اتنے دن آپ کی تابعداری کرتے ہو گئے۔ کبھی ایک ٹہنی بھی چھوئی ہے؟"

عرفان علی۔ تم قسم کھا سکتے ہو؟

درگا۔ حضور گنگا کی قسم جو میں نے آموں میں ہاتھ بھی لگایا ہو۔

عرفان علی۔ اس قسم کی سند نہیں۔ تم لوٹے میں پانی لاؤ۔ اس میں تلسی کے پتے رکھو۔ اور تب قسم کھا کر کہو۔ کہ اگر میں نے آم توڑے ہوں۔ تو میرا لڑکا میرے کام نہ آئے تب مجھے تمہارے اوپر اعتماد ہو گا۔

درگا۔ حضور سانچ کو آنچ کیا۔ جیسے کہئے قسم کھا جاؤں۔ جب میں نے کام ہی

نہیں کیا۔ تب مجھ پر قسم کیا پڑے گی؟

عرفان علی۔ باتیں نہ بناؤ، جاکر پانی لاؤ۔

ڈاکٹر صاحب قیافہ شناس آدمی تھے۔ رات دن مجرموں سے سابقہ رہتا تھا درگا اگرچہ زبان سے دلیرانہ باتیں کر رہا تھا۔ پر اس کے دل میں خوف سمایا ہوا تھا۔ وہ اپنے جھونپڑے میں آیا۔ لیکن لوٹے میں پانی لے کر بھر جانے کی اس کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کے ہاتھ تھر تھرانے لگے۔ کئی ایسے واقعے یاد آگئے۔ جب کہ جھوٹی گنگا اٹھانے والوں پر آسمانی بلائیں نازل ہو گئی تھیں۔ بھگوان کے حاضر و ناظر ہونے کا ایسا یقین آج تک اسے نہ ہوا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ میں جھوٹی گنگا نہ اٹھاؤں گا۔ یہی ہو گا۔ نا کہ برخاست ہو جاؤں گا۔ کچھ جرمانہ ہو جائے گا۔ یہ منظور ہے۔ نوکری بھی کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی۔ اور نوکری نہ بھی ملے تو مزدوری تو کہیں نہیں گئی ہے۔ کدال بھی چلاؤں گا۔ تو چار پانچ آنے روز پا جاؤں گا۔

وہ آہستہ آہستہ خالی ہاتھ ڈاکٹر صاحب کے سامنے آکھڑا ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے تند لہجہ میں کہا "پانی لاؤ؟"

درگا۔ حضور میں گنگا نہ اٹھاؤں گا۔

ڈاکٹر۔ تو ثابت ہو گیا، کہ تم نے ضرور آم توڑے۔

درگا۔ اب سرکار جو چاہیں سمجھیں۔ مان لیجئے میں نے ہی توڑ لیے تو آپ کا غلام ہوں۔ رات دن تابعداری کرتا ہوں۔ بال بچے آموں کے لیے روئیں تو کہاں جاؤں۔ اب کے جان بکسی کی جائے۔ پھر ایسی کھتا نہ ہو گی۔

ڈاکٹر صاحب اتنے فیاض نہ تھے۔ انہوں نے یہی احسان کیا۔ کہ درگا کو پولیس کے

سپرد نہ کیا اور نہ اسے ہنٹر لگائے، اس کے مذہبی اعتقاد نے انہیں کچھ نرمی کی طرف مائل کر دیا تھا۔ مگر ایسے بدنیت شخص کو اپنے یہاں رکھنا غیر ممکن تھا۔ انہوں نے دم درگا کو معزول کر دیا۔ اور اس کی باقی تنخواہ جرمانہ میں ضبط کر لی۔

(۳)

کئی ماہ گزرنے کے بعد ایک روز ڈاکٹر عرفان علی مسٹر پریم شنکر کے باغیچہ کی سیر کرنے گئے۔ وہاں سے چند اچھی اچھی قلمیں لانے کا ارادہ تھا۔ پریم شنکر کو بھی باغبانی کا شوق تھا اور دونوں آدمیوں کے درمیان یہی ایک مناسبت تھی۔ ورنہ دونوں بالکل متضاد تھے۔ پریم شنکر قناعت پسند، سادہ مزاج غریب دوست آدمی تھے۔ وہ کئی سال امریکہ میں رہ چکے تھے۔ وہاں زراعت اور فلاحت کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اور اب یہاں آکر اسی فن کو ذریعۂ معاش بنا لیا تھا۔ انسانی خاصہ اور موجودہ نظامِ معاشرت کے متعلق ان کے عجیب خیالات تھے۔ جن کے باعث شہر کے مہذب طبقہ کے لوگ انہیں مراقی فاتر العقل سمجھتے تھے ان کے خیالات سے لوگوں کو ایک قسم کی فلسفیانہ ہمدردی ضرور تھی۔ مگر اس میں لوگوں کو شک تھا کہ ان پر عمل بھی کیا جا سکتا ہے، یہ عمل کی دنیا ہے۔ فلسفہ کی دنیا نہیں ہے۔ یہاں فلسفہ ہمیشہ فلسفہ ہی رہے گا۔ اسے واقعاتِ زندگی سے کوئی علاقہ نہیں۔ ڈاکٹر صاحب باغیچہ میں داخل ہوئے تو پریم کو کیاریاں سینچتے ہوئے پایا۔ کنوئیں پر ایک سفید پوش آدمی کھڑا ایمپ سے پانی نکال رہا تھا۔ وہ درگا مالی تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے دل میں اس وقت درگا کی جانب سے بغض للّٰہ سا پیدا ہوا۔ جس شخص کو انہوں سزا دے کر اپنے یہاں سے علیحدہ کر دیا تھا۔ اسے اس قدر خوش باش ہونے کا کیا حق تھا۔ اگر درگا اس وقت پھٹے حال، رونی صورت بنائے نظر آتا۔ اور انہیں دیکھتے ہی ان کے سامنے

ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا۔ تو شاید ڈاکٹر صاحب کو اس پر رحم آجاتا وہ اسے غالباً کچھ انعام دیتے اور پریم شنکر سے اس کی نسبت چند کلماتِ خیر کہنے کی تکلیف گوارا کرتے وہ خاصۃً نیک آدمی تھے۔ اور اپنے ملازموں سے مہربانی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ مگر ان کی اس مہربانی اور اس التفات میں مطلق فرق نہ تھا جو انہیں کتوں یا گھوڑوں کے ساتھ تھی۔ اس مہربانی کی بنیاد انصاف پر نہیں رحم پر تھی۔ درگا نے انہیں دیکھا۔ کنویں پر کھڑے کھڑے ادب سے سلام کیا۔ اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کی یہ خودداری ڈاکٹر صاحب کے جگر میں کانٹے کی طرح چُبھی۔ انہیں اس خیال سے غصہ آیا کہ میرے یہاں سے نکلنا اس کے حق میں اکسیر ہو گیا۔ پریم شنکر جوں ہی ان سے مصافحہ کر کے انہیں چند نئے تختوں کی طرف لے چلے تو ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔ "یہ آدمی آپ کے یہاں کتنے دنوں سے ہے؟"

پریم شنکر۔ چار پانچ مہینے ہوئے ہوں گے۔

عرفان علی۔ کچھ نوچ کھسوٹ تو نہیں کرتا۔ اس سے پہلے یہ میرے یہاں مالی تھا۔ اس کی دست درازیوں سے تنگ آکر میں نے اُسے نکال دیا تھا۔ کبھی پھول توڑ کر بیچ لیتا۔ اور کبھی پودے اکھاڑ کر لے جاتا اور پھولوں کا تو ذکر ہی کیا۔ ایک بار میں نے چند احباب کی دعوت کی تھی۔ ملیح آبادی سفیدہ خوب پھلا ہوا تھا۔ جب سب لوگ آکر بیٹھ گئے اور میں درخت کے پاس گیا تو سارے پھل غائب کچھ نہ پوچھئے، اس وقت کتنی خفت ہوئی۔ میں نے اسی وقت ان حضرات کو دھتکار بتائی۔ بڑا ہی دغاباز بدنیت آدمی ہے۔ اور ایسا شاطر کہ اسے گرفتار کرنا محال ہے۔ کوئی وکیل ہی جیسا کائیاں آدمی ہو تو اسے پکڑ سکتا ہے۔ ایسی صفائی اور دلیری سے انکار کرتا ہے کہ اس کا منہ

تکتے رہ جایئے، آپ کو تو کبھی چرکا نہیں دیا؟

پریم شنکر۔ جی مطلق نہیں، مجھے اس نے شکایت کا کبھی موقعہ نہیں دیا۔ یہاں تو خوب محنت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ دوپہر کی چھٹی میں بھی آرام نہیں کرتا مجھے تو اس پر اتنا بھروسہ ہوگیا ہے کہ سبزی، پھل، پودے، بیج سب اسی کے ہاتھوں میں چھوڑ دئے ہیں۔ دن بھر کو جو آمدنی ہوتی ہے۔ وہ شام کو مجھے دے دیتا ہے۔ اور کبھی ایک پائی کا بھی فرق نہیں ہوتا۔

عرفان علی۔ جناب یہی تو اس کی مشاقی کی تعریف ہے کہ آپ کو الٹے استرے سے مونڈے اور آپ کو خبر نہ ہو، آپ اسے کیا تنخواہ دیتے ہیں۔

پریم شنکر۔ یہاں کسی کو تنخواہ نہیں دی جاتی۔ سب آدمی نفع میں برابر شریک ہوتے ہیں۔ مہینہ میں ضروری اخراجات نکالنے کے بعد جو کچھ آمدنی ہوتی ہے۔ اس پر دس فیصدی کار خیر کے لیے الگ کرلیا جاتا ہے۔ باقی روپے برابر تقسیم کردیئے جاتے ہیں پچھلے ماہ ۱۴۰ روپے کی آمدنی ہوئی تھی۔ مجھے ملاکر کل سات آدمی ہیں۔ ہر ایک کے حصّہ میں بیس بیس روپے آئے تھے۔ اب کی ماہ میں جوار ہو گئی ہے۔ امرود اچھے آئے ہیں۔ زیادہ آمدنی کی امید ہے۔

عرفان علی نے تعجّب سے پوچھا "کیا آپ اس قدر قلیل آمدنی پر بسر کرلیتے ہیں؟"

پریم شنکر۔ جی ہاں بہت آسانی سے۔ میں ان مصنوعی ضروریات کا پابند نہیں ہوں جسے آج کل داخل تہذیب سمجھا جاتا ہے۔ میں وہی کپڑے پہنتا ہوں، وہی کھانا کھاتا ہوں۔ اور اسی طرح رہتا ہوں۔ زیادہ کی ضرورت ہی کیوں ہو؟ دس بیس روپے ماہوار ادویات کا صرفہ ہے جو غرباء کو تقسیم کی جاتی ہیں۔ یہ رقم مشترکہ آمدنی سے وضع

کی جاتی ہے۔ اور سب کے سب آدمی اس ثواب میں شریک ہوتے ہیں۔ سائیکل جو آپ کو نظر آرہی ہے وہ مشترکہ رقم سے لی گئی ہے۔ جسے ضرورت ہوتی ہے۔ اس پر سوار ہوتا ہے۔ چونکہ ان آدمیوں کو مجھ پر زیادہ اعتبار ہے۔ اس لیے وہ مجھے اپنا مکھیا سمجھتے ہیں۔ اور میرے علم و تجربہ کے باعث میرا دبادٔ مانتے ہیں۔ جو کچھ کہتا ہوں اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ کوئی یہ محسوس نہیں کرتا۔ کہ میں کسی کا نوکر ہوں۔ سب کے سب ساجھے دار ہیں۔ اس لیے سب جان توڑ کر محنت کرتے ہیں۔ اور کامل ایمانداری کے ساتھ جب ایک شخص مالک اور دوسرا اس کا نوکر ہوتا ہے۔ تو فوراً رقابت شروع ہو جاتی ہے۔ مالک چاہتا ہے۔ کہ میں اس محنت سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کروں۔ نوکر چاہتا ہے کہ میں کم سے کم کام کروں۔ ان کے درمیان ذرا بھی ہمدردی یا برادرانہ تعلق نہیں ہوتا۔ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں۔ کام چھوٹا ہو یا بڑا۔ اس رقیبانہ کشمکش کا نتیجہ بُرا ہوتا ہے۔ اس نے دنیا میں دولت اور افلاس کے دو جُدا جُدا فرقے ہیں۔ اور ان میں خونریز جنگ ہو رہی ہے۔ مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ رقابت کا دور اب نزع کی حالت میں ہے۔ اس کی جگہ اب باہمی امداد اور ہمدردی کا دور شروع ہونے والا ہے۔ میں نے دوسرے ملکوں میں رقابت کے نظارے خوب دیکھے ہیں اور ان سے سیر ہو گیا۔ باہمی امداد میں نجات کی صورت نظر آتی ہے۔ اب ہمیں زبردستی کو خیرباد کہہ کر ایثار سے کام لینا پڑے گا۔

مسٹر قاں بالی۔ تو یہ کہیے کہ آپ سوشلسٹ ہیں۔

پریم شنکر۔ جی نہیں میں سوشلسٹ یا ڈیماکریٹ کچھ نہیں ہوں۔ میں صرف حق اور انصاف کا خادم ہوں۔ میں اخلاق کو علم سے بالاتر سمجھتا ہوں۔ علم اور ذہانت

فہم وفراست یا دیگر ذہنی اور دماغی اوصاف کو ہوس اور زر پرستی کا غلام نہیں بنانا چاہتا۔ مجھے موجودہ تعلیم اور تہذیب پر مطلق اعتماد نہیں ہے۔ علم کا کام ہے۔ تہذیب اخلاق اور تہذیب اخلاق کا نتیجہ فیاضی، فراخدلی، ایثار، بے نفسی، ہمدردی، غریب دوستی، اور انصاف پسندی ہے۔ وہ تعلیم جو ہمیں ثروت وجاہ کا غلام بنادے جو ہمیں زیردست آزادی پر مائل کرے۔ جو ہمیں دوسروں کا خون پی کر فربہ ہونے کی تحریک دے۔ تعلیم نہیں شیطنت ہے۔ جہلا حرص وطمع کے بس ہو جائیں۔ تو قابلِ معافی ہیں۔ مگر مدعیانِ علم و تہذیب کے لیے نفس پرستی حد درجہ شرمناک ہے۔ علم وفضیلت کو ہم نے بامِ ثروت کا زینہ بنالیا۔ حالانکہ وہ خدمت کا وسیلہ تھا۔ اونچی سے اونچی تعلیم پائے ہوئے لوگ زیادہ سے زیادہ حریص نظر آتے ہیں۔ بس زبردستی ہماری تعلیم و تہذیب کا معیار ہے۔ میں اس تعلیم سے جہالت کو بدرجہا بہتر سمجھتا ہوں۔ ہمارے پروفیسر صاحب ایک ہزار سے کم تنخواہ پائیں، تو ان کا منہ نہیں سیدھا ہوتا۔ ہمارے دیوانی اور مال کے حکام دو ہزار ماہوار تنخواہ پانے پر بھی شکوۂ تقدیر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب چاہتے ہیں کہ ساری دنیا مریض ہو جائے۔ اور میں سونے کی دیوار کھڑی کر لوں۔ اور ہمارے وکیل صاحب (معاف کیجئے گا) اپنی قانون دانی کو ہیرے کے تول بیچنا چاہتے ہیں۔ سب کے سب وقعت، دولت ہے کے ٹکے کے غلام بنے بیٹھے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک سینکڑوں، ہزاروں آدمیوں کی روزی غصب کر لیتا ہے۔ اور پھر بھی خادم قوم بننے کا دعویٰ کرتا ہے۔ رعایا فاقہ کشی کرے یا بے بستر رہے، خاطر خواہ ہے ہر سے ہمارا دماغی گروہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ پیدا دوسرے کریں کھانا ہمارا کام ہے۔ میں اس گروہ کو محض وجود معطل نہیں بلکہ شر دائر سمجھتا ہوں۔

ڈاکٹر عرفان علی نے بہت تحمل سے کام لے کر پوچھا۔ "تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم سب مزدوری کریں؟"

پریم شنکر۔ جی نہیں، اگر ایسا ہو تو میں اسے نوعِ انسان کے لیے مایۂ خیر و برکت سمجھوں۔ مجھے صرف حالات میں اس درجہ تفاوت سے اعتراض ہے۔ اگر ایک غریب آدمی پانچ روپے ماہوار میں گزار سکتا ہے تو ایک دماغی کام کرنے والے آدمی کے لیے اس کی دگنی چوگنی رقم کافی ہونی چاہیے۔ مگر پانچ اور پانچ ہزار، پچاس اور پچاس ہزار کا بعد المشرقین کیوں ہو؟ انتظامِ سلطنت قانونی فیصلہ، قانون کی حمایت طبابت، تصویر کشی، رقاصی معلمی، دلالی، تجارت اور صدہا دیگر پیشے ایسے ہیں۔ جن میں ایک بھی کسبِ دولت نہیں کرتا۔ ان سب کا مدار دوسروں کی کمائی پر ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ پیشے جو ضروریات زندگی پیدا کریں۔ قیامِ حیات کے لیے سامان بہم پہنچائیں۔ آج دنیا کے سارے مدبر، سارے وکیل، سارے دلال، سارے پروفیسر معرضِ فنا میں آجائیں۔ تو دنیا آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ گرائے گی۔ بلکہ خوشی سے گھی کے چراغ جلائے گی۔ اس کے سر سے ایک بوجھ اُتر جائے گا، کاشتکار اپنا ہل چلائے گا۔ اور اپنے گوشۂ قناعت اور عافیت میں بیٹھا ہوا آرام سے زندگی بسر کرے گا۔ آپ فرمائیں گے۔ یہ تو تمدن کے دورِ اوّلین کا نقشہ ہے۔ انسان نے قرنوں اور صدیوں میں جو ترقیاں کی ہیں۔ ان کو ہٹا کر پھر اسی دورِ توحش کی طرف واپس جاتا ہے۔ آپ فنونِ لطیفہ کی ترقی کو انسان کے جذباتی اور روحانی عروج کا لازمہ قرار دیں گے۔ علیٰ ہذا آپ کو موجودہ تہذیب کا ہر ایک پہلو حیاتِ انسانی کے لیے ضروری نظر آئے گا۔ کیونکہ انسان محض چوپایہ نہیں ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ تہذیب اور ترقی خود غرضی

اور جفا شعاری کی ایک مستور صورت ہے اور کچھ نہیں ہے۔ ہندوستان کا کاشتکار چین کے مزارع سے لڑنے نہیں جاتا۔ اسی تعلیم یافتہ گروہ نے اپنے مطلب کے لیے قوم کا سوانگ کھڑا کیا۔ قومی حقوق کی حفاظت کے لیے فوجیں بنائیں۔ انصرام سلطنت کا نقشہ کھینچا۔ مسائل بین الاقوام کی ایجاد، تجارت اور صنعت کے لاینحل عقدے اختراع کیے۔ اور اب اپنی فتوحات پر ناز کرتا ہے۔ اپنی تہذیب پر پھولا نہیں سماتا۔

عرفان علی۔ آپ اقتصادیات کے مسئلہ پر تقسیم محنت کو بالکل نظر انداز کر رہے ہیں۔ قدرت نے افراد کو خاص خاص قابلیتیں عطا کی ہیں۔ ان کے بہترین استعمال کے لیے خاص موقعوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

پریم شنکر۔ میں یہ کب کہتا ہوں کہ ہر فرد مزدوری کرنے پر مجبور ہو۔ نہیں جیسے پرماتما نے غور و فکر کی قوت عطا کی ہے۔ وہ فلسفیانہ مسائل کی تحقیق کرے، جس کے جذبات مضبوط اور عمیق ہوں۔ وہ شعر و سخن میں طبع آزمائی کرے۔ علیٰ ہٰذا میری دلیل صرف یہ ہے کہ پیشوں میں اس قدر امتیاز نہ رہنا چاہیے۔ دماغ سے تعلیم و تہذیب اور درس و تدریس کا کام لینا چاہیے۔ جذبات سے روحانی اور اخلاقی اصلاح کا۔ مگر ان دماغی یا روحانی کمالات کو ذریعۂ ثروت نہ بنانا چاہیے۔ میرے خیال میں بہتر یہ ہے کہ ہر شخص اپنے ہاتھوں سے کسب معاش کرے۔ اور دل و دماغ صرف قوم کی اصلاح و فلاح، روحانی مسائل کی تحقیق و تدقیق، علمی معلومات کی اشاعت اور ترویج کے لیے وقف ہوں۔ لیکن تاوقتیکہ ہم اس اعلیٰ معیار تک نہ پہنچ سکیں۔ ہم کو ذہنی اور حرفتی پیشوں میں اس غیر فطری امتیاز کو مٹانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کیونکہ یہ آئین قدرت کے بالکل خلاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ لازمی پیشوں کو تفوق ہو بعض اہل الرائے

کا خیال ہے کہ اس تسویہ سے اہلِ کمال بد دل ہو جائیں گے۔ اور دنیا اِن کے انوارِ فیض سے محروم ہو جائے گی۔ مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ دنیا کے بڑے سے بڑے حکماء، بڑے سے بڑے شعراء، بڑے سے بڑے موجد، بڑے سے بڑے اربابِ فنونِ لطیفہ مال و زر سے بے نیاز تھے۔ اس وقت کمال کا معاوضہ اپنے قلب کی تسکین تھی۔ نوع کی ضرورت محرک کہاں تھی۔ جب سے کمال نے دولت کا دامن پکڑا۔ اسی وقت سے تہذیب کا انحطاط شروع ہوا۔

ڈاکٹر عرفان علی اب زیادہ صبر نہ کر سکے۔ بولے "آپ کا مجوّزہ نظامِ معاشرت فرشتوں کی دنیا کے لیے چاہے موزوں ہو۔ لیکن اس عملی دنیا کے لیے اور اس عملی دور میں ہرگز موزوں نہیں ہے۔"

پریم شنکر۔ محض اسی لیے کہ ابھی تک سرمایہ داروں کا اور مہذب جماعت کا عوام پر اقتدار ہے؟ مگر اس کے قبل بھی بارہا اس اقتدار کو زک ہو چکی ہے اور قرائن بتلا رہے ہیں۔ کہ زمانہ قریب میں اب اسے پھر زک پہنچنے والی ہے۔ شاید اب کے یہ شکست فیصلہ کن ہوگی۔ تہذیب کا دور جمہوریت سے شروع ہو کر جمہوریت ہی پر ختم ہوتا ہے۔ شاہی حکومت رؤسا کا اقتدار، سرمایہ داروں کی بالادستی یہ درمیانی منازل ہیں۔ موجودہ دور نے درمیانی منزلیں طے کر لی ہیں۔ اور اپنی آخری منزل تک آ پہنچا ہے مگر ہم ابھی تک اپنی ثروت اور اختیار کے نشہ میں اس قدر مخمور ہیں۔ کہ ہم کو آثار و قرآن بالکل نہیں آتے۔ اطراف عالم سے جمہور کی گھنگھور صدائیں ہمارے کانوں میں پہنچ رہی ہیں۔ مگر ہم ابھی تک ایسے بے خبر ہیں۔ گویا عالم خواب میں ہوں۔ ہم اپنی یونیورسٹی ایجوکیشن۔ اپنے قانونی انہماک، اپنے ڈرامہ اور تھیئٹر، اپنے مل اور کارخانوں اور اسی

قسم کے دوسرے مشاغل میں محو ہیں۔ جس کا منشار دوسروں کی کمائی اور منفعت پر موٹا ہونا ہے۔ موجودہ گرانی ضروریات پر سارے عالم میں واویلا مچا ہوا ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔ اس سے ہماری تہذیب کے تاریک پہلو پر کیسی صاف روشنی پڑتی ہے۔ اب مہذب دنیا کو تجربہ ہو رہا ہے کہ تھیٹر کا وہ ایکٹر جو پانچ ہزار روپیہ ماہوار پیدا کرتا ہے۔ معاشرت کا ضروری جزو ہے۔ یا وہ غریب کندۂ ناتراش کاشت کار جسے ہم حیوان مطلق سمجھنے کے عادی ہیں۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں۔ کہ دُرگا مالی ایک ڈالی میں کچھ پھل، چند جوار کی بالیں۔ چند آم سجا کر لایا۔ اس کے انداز اور بُشرہ سے ایک خوددارانہ متانت برس رہی تھی۔ گویا اب وہ ذاتی اہمیت سے باخبر ہو گیا ہے۔ وہ سلام کر کے ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا اور ڈاکٹر صاحب سے پوچھا: "آپ کو کن چیزوں کی قلمیں چاہئیں۔ آپ بابو جی کو آرڈر دیجیے۔ میں کل آپ کے مکان پر پہنچا دوں گا۔ بال بچّے تو اچھی طرح ہیں؟"

عرفان علی نے کسی قدر محجوب ہو کر کہا: "ہاں لڑکے اچھی طرح ہیں۔ تم یہاں آرام سے ہو؟"

دُرگا۔ جی ہاں۔ سب حضور کی مہربانی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک کاغذ پر چند قلموں کے نام لکھ کر رکھ دیئے۔ اور رخصت مانگی۔ پریم شنکر ان کے ساتھ ساتھ پھاٹک تک آئے۔ ڈاکٹر صاحب دروازہ پر متانت سے مسکرا کر کہا "حضرت میں آپ کے اصولوں کا قائل تو نہیں ہوا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ آپ نے ایک کمینہ اور شیطان آدمی کو انسان بنا دیا۔ یہ آپ کی صحبت کا فیض ہے میں ذات کا قائل ہوں۔ انسٹی ٹیوشنوں کا قائل نہیں۔ لیکن معاف فرمائیے گا۔ میں پھر بھی کہوں گا۔ کہ اس سے ہوشیار رہیئے گا۔ ایجونیکس کا علم ابھی تک کوئی ایسا نسخہ ایجاد نہیں کر سکا۔ جو تخم کی تاثیر کو مٹا دے۔

آتمارام

(۱)

موضع بنیدو میں مہادیو سُنا ایک نمایاں وجود تھا۔ وہ اپنے کھپریل کے بوسیدہ سائبان میں انگیٹھی کے سامنے بیٹھا ہُوا صبح سے پہر رات ہتھوڑا لیے کھٹ کھٹ کیا کرتا تھا۔ اس صدائے پیہم کے لوگ اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ جب کسی وجہ سے یہ آوازیں بند ہو جاتیں تو ایسا معلوم ہوتا گویا کوئی چیز غائب ہو گئی ہے۔ وہ روز ایک بار صبح کو اپنے طوطے کا پنجرہ لیے کوئی بھجن گاتا ہُوا تالاب کی طرف جاتا تھا۔ اس وقت اندھیرے میں اس کی جھکی ہوئی کمر اور اس کا جسم نحیف دیکھ کر کسی اجنبی شخص کو اس پر شیطانی وجود کا دھوکا ہو سکتا تھا۔ اس کے یہ بھجن تعیّنِ وقت کے اعتبار سے صدائے مُرغ کا کام دیتے تھے

جوں ہی کانوں میں آواز آتی "ست گردت شودت داتا" لوگ سمجھ جاتے کہ سویرا ہو گیا۔ اس کی یہی حرکت اس کے تکمیل اعضاء کا ثبوت تھی۔ ورنہ طلوع سحر کے بعد پھر اسے ایک متحرک بسٹ خیال کرنے میں اگر کوئی امر مانع تھا تو یہ وہی ست گردت کا کلمۂ وحدت تھا۔ جس سے وہ اپنے طوطے کو عبادت کی تلقین کیا کرتا تھا۔ فی الواقع مہادیو بے کارہستی کا ایک نادر مجسمہ تھا۔ جو شکستوں اور ناکامیوں سے بیخبر۔ زخموں اور چرکوں سے بے پروا۔ ابھی تک شمشیر بکف میدان میں مردانہ وار کھڑا تھا جو اس کا بشرہ منتشر دانتوں کا دستہ پامال کمر کا میمنہ متزلزل۔ خون قلب پریشان ہو چکا تھا۔ مگر ہمت وہی تھی، استقلال وہی جس پر شباب کو رشک ہو سکتا تھا۔

مہادیو خوش نصیب بھی تھا اور کم نصیب بھی۔ خوش نصیب اس لیے کہ اس کے تین لڑکے تھے۔ تین بہوئیں تھیں اور بہوؤں کے لڑکے تھے۔ لڑکے کہتے اجی جب تک دادا جیتے ہیں تب تک تو زندگی کا لطف اٹھالیں۔ پھر تو یہ ڈھول گلے پڑے ہی گی۔ ممکن تھا کہ لڑکے اپنے باپ کی کچھ مدد کرتے۔ لیکن چونکہ مہادیو اپنے بزرگانہ اختیارات سے مستعفی نہ ہوتا تھا۔ اس لیے لڑکے اس کی ذمہ داریوں میں مخل ہونے کی ضرورت بھی نہ سمجھتے تھے اور اس لازم وملزوم کی چکی میں پڑا ہوا وہ نیم جان خستہ حال بڈھا پسا جاتا تھا۔ اس پر لطف یہ کہ

انقضاء عمر کے ساتھ ان ذمہ داریوں کی نسبت معکوس تھی۔ دائرۂ کفالت
روز بروز وسیع اور وسائل معاش روز بروز تنگ ہوتے جاتے۔
پہلے کوزہ کا ذوق پھادیو کی ذات تک محدود تھا۔ پر اب سعادتمند
بیٹے بھی باپ کے نقش قدم پر چلنے لگے تھے۔ پھادیو کو ساقی اور
بسا اوقات ساقی ناکام کا پارٹ ادا کرنا پڑتا تھا۔ بیٹے اس وقت
جذباتِ حریت اور مساوات کے ایسے پُر شور مناظرے کرتے کہ کبھی
کبھی یہ جوش فرزندانہ سعادت مندی پر بھی غالب آجاتا تھا اور
اس وقت تک فرو نہ ہوتا تھا۔ جب تک کہ ماکولات کی مساوی
مقدار ان کی تسکین قلب کے لیے نہ پہنچ جاتی۔ بیچارہ پھادیو کبھی کبھی
اس شورِ قیامت سے تنگ آکر جھو کا اُٹھ آتا اور اپنے غمگسار حقے
کا نغمۂ شرریں سنتا سنتا سو جاتا۔ افسوس یہی ہے کہ باہر بھی اُسے ان
باغیانہ مناظروں سے نجات نہ تھی۔ باوجودیکہ وہ اپنے فن میں یگانۂ
روزگار تھا۔ ان کی گھٹا اوروں سے کہیں زیادہ دیر اثر تھی۔ اس
کی صفائی کہیں زیادہ وقت طلب اور اُس کے کیمیائی عمل کہیں زیادہ
قوی الناثیر۔ تاہم اُسے بے صبر اور وہمی اشخاص کی بدزبانیوں کا آئے
دن نشانہ بننا پڑتا تھا۔ پر پھادیو عابدانہ توکل کے ساتھ سر جھکائے
ہوئے چاروں طرف کی بوچھاڑیں سہا کرتا۔ اس کے کان روزانہ
نفریں اور دشنام طعن و تشنیع کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ اسے
اب ان کا احساس ہی نہ ہوتا تھا۔ جوں ہی یہ طوفان فرو ہوتا۔ وہ اپنے

طوطے کی طرف دیکھ کر پکار اٹھتا "ست گرو دت شیو دت داتا"۔
اس اسم اعظم کا ورد اس کی تشفی کامل کا وسیلہ بن جاتا تھا۔ یہ چھوٹکے
اس کی زندگی کے ایک جزو لازم بن گئے تھے۔ ان سے اس کے سکون
میں مطلق فرق نہ پڑتا تھا۔

(۲)

ایک روز اتفاق سے کسی لڑکے نے پنجرے کا دروازہ کھول
دیا۔ طوطا اڑ گیا۔ بھادیو نے سر اٹھا کر پنجرے کی طرف دیکھا اور
اس کا کلیجہ سن سے ہو گیا۔ ایں! طوطا کہاں گیا! اس نے پھر پنجرے
کی طرف دیکھا۔ طوطا غائب تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھا اور ادھر ادھر کھپریلوں
پر نظر دوڑانے لگا۔ اسے دنیا میں اگر کوئی چیز پیاری تھی تو یہ طوطا تھا۔
لڑکے بالوں۔ ناتی پوتوں سے اس کی طبیعت آسودہ ہو گئی تھی۔
وہ کبھی کسی بچے کو گود میں نہ لیتا۔ بچوں کی شرارت سے اس کے کام
میں ہرج ہوتا تھا۔ کوئی ہتھوڑا چھین لیتا۔ کوئی سنسی اٹھا لیتا۔
اس لیے وہ اپنے قریب بھی نہ آنے دیتا تھا۔ بیٹوں سے اسے مطلق الفت
نہ تھی۔ نہ اس لیے کہ وہ کاہل و بیجود تھے بلکہ اس لیے کہ وہ اس کے شریک
کوزہ ہو جاتے تھے۔ محلہ کے آدمیوں سے اسے چڑ تھی۔ اس لیے کہ وہ
اس کی بھٹی سے آگ نکال لے جاتے تھے۔ اس تمام مجمع شر سے اس
کے لیے کوئی پناہ تھی تو وہ یہی طوطا تھا جس کی ذات سے اسے کوئی
تکلیف، کوئی الجھن کوئی پریشانی نہ ہوتی تھی۔ وہ اب زندگی کی اس

منزل پر پہنچ گیا تھا۔ جب انسان کی نگاہوں میں عافیت کی۔ گوشۂ امن کی وقعت دنیا کی اور سب چیزوں سے زیادہ ہو جاتی ہے۔

طوطا ایک کھپریل پر بیٹھا تھا۔ مہادیو نے پنجرا اُتار لیا اور اُسے دکھا کر کہنے لگا۔ "آ۔ آ۔ ست گرُ دت۔ شیو دت داتا۔ آ۔ آ" لیکن گاؤں اور گھر کے کئی لڑکے جمع ہو کر چلّانے اور تالیاں بجانے لگے۔ اوپر سے کوّوں نے کائیں کائیں شروع کی۔ طوطا اُڑا۔ اور گاؤں سے باہر نکل کر ایک درخت پر جا بیٹھا۔ مہادیو بھی خالی پنجرا لیے اس کی طرف دوڑا۔ ہاں دوڑا! لوگ اس کی تیز گامی پر عش عش کرتے تھے ہوس کی اس سے بہتر اس سے جامع اس سے زندہ تصویر شاید کسی مصور کے خیال میں نہیں آسکتی۔ پُشت دوتا اور سرعت گام میں کوئی نفاق نہیں ہے۔ اس کی تصدیق ہو گئی۔

دوپہر ہو گئی تھی۔ کسان پر چھوڑ چھوڑ کر چلے آتے تھے۔ اس موقعہ تفریح کو کیوں ہاتھ سے جانے دیتے۔ مہادیو کی دل آزاری میں ہر شخص کو مزہ آتا تھا۔ بالمخصوص اس کی نکالو ٹے پُرخم کا نظارہ نہایت فرحت انگیز تھا۔ لوگوں نے کنکر پھینکے۔ تالیاں بجائیں۔ طوطا پھر اُڑا اور اس درخت سے دور۔ آم کے گھنے باغ میں ایک درخت کی چوٹی پر جا بیٹھا مہادیو پھر خالی پنجرا لیے آ۔ آ کرتا طوطے کی طرف ٹکٹکی لگائے مینڈک کی طرح اُچکتا ہوا چلا۔ کسانوں کا غول بھی ہو حق مچاتا ہوا اس کے پیچھے دوڑا۔ مگر اُس کی سرگرمی طلب ان کے شوقِ تفریح پر غالب آئی۔ جب

وہ اس گھنے باغ میں پہنچا تو اکیلا تھا۔ اُس نے سایہ میں ذرا دم لیا۔ پیر کے تلووں سے آگ نکل رہی تھی۔ جب ہوش بجا ہوئے تو اس نے پھر پنجرا اُٹھایا اور پھر کہنے لگا "ست گرو دت شیو دت داتا۔ آ۔ آ!"

طوطا پھنگی سے اتر کر نیچے کی ایک شاخ پر آ بیٹھا۔ مگر مہادیو کی طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھ کر پھر اُڑا اور دوسری شاخ پر جا بیٹھا مہادیو نے سمجھا مجھ سے ڈر رہا ہے۔ وہ پنجرے کو چھوڑ کر آپ ایک دوسرے درخت کی آڑ میں چھُپ گیا۔ طوطے نے چاروں طرف غور سے دیکھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ اُترا اور آ کر پنجرے کے اوپر بیٹھ گیا۔ مہادیو کا کلیجہ اُچھلنے لگا۔ ست گرو دت شیو دت کا ورد کرتا ہوا آہستہ آہستہ طوطے کے قریب آیا اور تب ایک جست مار کر لپکا کہ طوطے کو پکڑ لے مگر طوطا ہاتھ نہ آیا۔ پھر اُڑ کر درخت پر جا پہنچا۔

شام تک یہی کیفیت رہی۔ طوطا کبھی اس شاخ پر جاتا۔ کبھی اُس شاخ پر۔ کبھی پنجرے پر آتا۔ کبھی پنجرے کے دروازے پر بیٹھ کر اپنے دانہ پانی کی پیالیوں کو دیکھتا مگر جونہی مہادیو اس کی طرف آتا۔ وہ پھر اُڑ جاتا۔ بڈھا اگر پیکرِ ہوس تھا تو طوطا طائرِ آرزو۔ یہاں تک کہ شام سیاہ نے ہوس اور آرزو کی اس کشمکش پر پردہ ڈال دیا۔

(۳)

رات ہو گئی۔ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ طوطا معلوم نہیں

پتوں میں کہاں چھپا بیٹھا تھا۔ مہادیو خوب جانتا تھا۔ کہ رات کو کہیں طوطا اُڑ کر نہیں جا سکتا اور نہ پنجرے میں آ سکتا ہے۔ تاہم وہ اس درخت کے نیچے سر جھکائے پنجرے کو پہلو میں رکھے بیٹھا ہوا تھا۔

آج اس نے دن بھر کچھ نہیں کھایا۔ رات کے کھانے کا وقت بھی نکل گیا۔ ایک بوند پانی بھی اس کے حلق میں نہیں گئی۔ لیکن اُسے نہ بھوک، تھی نہ پیاس۔ طوطے کے بغیر اسے اپنی زندگی ویران۔ خشک دُشوار معلوم ہوتی تھی۔ وہ شب و روز مشقت کرتا تھا۔ اس لیے کہ یہ اس کی تحریک طبعی تھی۔ زندگی کے اور سب کام اس لیے کرتا تھا کہ اس کی عادت تھی۔ ان کاموں میں اُسے حیات کا مطلق احساس نہ ہوتا تھا۔ طوطا ہی ایک ایسی چیز تھا۔ جو اُسے اس کی حیات کی یاد دلاتا تھا۔ عملاً وہ ایک مُردہ وجود تھا۔ کوئی شوق نہیں۔ کوئی آرزو نہیں۔ کوئی فکر نہیں۔ کوئی ہوس نہیں۔ اس حیاتِ مطلق میں یہی طائرِ خوش رنگ و خوش نوا اُسے علائقِ زیست کی خبر دیتا تھا۔ اس تاریکی میں یہی ایک روشنی تھی۔ اس سناٹے میں یہی ایک صدا۔ اس کا ہاتھ سے جانا اپنے وجود سے بیخبر ہونا تھا۔

مہادیو دن بھر کا بھوکا پیاسا تھکا ماندہ رہ رہ کر جھپکیاں لے لیتا تھا مگر ذرا ہی دیر میں وہ چونک کر پھر آنکھیں کھول دیتا اور اس فضائے تاریک میں اس کی آواز سنائی دیتی "ست گر دت۔ شیو دت داتا!"

آدھی رات گزر گئی تھی۔ یکبارگی وہ کوئی آہٹ پا کر چونکا۔ تو دیکھا۔

کہ ایک دوسرے درخت کے نیچے ایک دھندلا سا چراغ جل رہا ہے اور کئی آدمی بیٹھے ہوئے آپس میں آہستہ آہستہ کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ وہ سب شاید چلم پی رہے تھے۔ تمباکو کی مہک نے مہادیو کو بیتاب کر دیا۔ بلند آواز سے بولا۔ "ست گرو دت شیو دت داتا" اور ان آدمیوں کی طرف چلا۔ مگر جس طرح بندوق کی آواز سنتے ہی ہرن بھاگ جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ سب کے سب اٹھ کر بھاگے۔ کوئی ادھر گیا۔ کوئی اُدھر۔ مہادیو نے زور زور سے پکارنا شروع کیا۔ ٹھہرو! ٹھہرو! دفعتہً اسے خیال آگیا کہ یہ سب چور ہیں۔ وہ زور سے چلانے لگا "چور! چور! پکڑو۔ پکڑو!" چوروں نے پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھا۔

مہادیو چراغ کے پاس گیا تو اسے ایک کلسا رکھا ہوا ملا۔ وہ زنگ سے سیاہ ہو رہا تھا۔ مہادیو کا سینہ اچھلنے لگا۔ اس نے کلسے میں ہاتھ ڈالا تو اشرفیاں تھیں۔ اس نے ایک اشرفی باہر نکالی اور چراغ کے اجالے میں غور سے دیکھا۔ ہاں اشرفی تھی۔ اس نے کلسا اٹھا لیا۔ چراغ بجھا دیا اور درخت کے نیچے چھپ کر بیٹھ رہا مالِ حرام نے شاہ سے چور بنا دیا۔

اسے پھر اندیشہ ہو کہ ایسا نہ ہو چور واپس آجائیں اور مجھے تنہا دیکھ کر کلسا چھین لیں۔ اس نے کچھ کچھ اشرفیاں نکال کر کمر میں باندھ لیں۔ پھر ایک سوکھی لکڑی سے زمین کی مٹی ہٹا کر کئی جگہ گڑھے بنائے۔

اور انہیں اشرفیوں سے بھر کر مٹی سے ڈھانک دیا اور حالانکہ ابھی زیادہ تعداد کلسے ہی میں تھی لیکن اس کی کمر اور گڑھوں میں دو سو سے کم نہ تھیں۔

(۴)

مہادیو کی نظروں کے سامنے اب ایک دوسری دنیا تھی۔ نامی روشن۔ ذی حیات۔ فکریں۔ تمنائیں اور ارادے اُگے۔ بڑھے اور لہرانے لگے۔ افلاس کی سیاہ گھٹا ہٹتے ہی بزم انجم آراستہ نظر آئی۔ حالانکہ ابھی خزانے کے ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ باقی تھا۔ پر نامیہ کو معترض گلچیں کی کیا پروا؟ ایک پختہ مکان بن گیا صرافہ کی ایک شاندار دکان کھل گئی۔ عزیز و بیگانہ گلوگیر ہو گئے۔ بادہ گلگوں کے دور چلنے لگے۔ عیش و تکلف کے سامان فراہم ہو گئے۔ پھر تیرتھ جاترا کو چلے اور واپسی پر فیاضانہ دعوتِ عام ہونے لگی۔ اس کے بعد ایک شوالہ اور پختہ کنواں تعمیر ہو گیا اور وہ روز شام کو بیٹھ کر وہاں کتھا پران سننے لگا۔ سادھو سنتوں کی محفل سج گئی۔ دورۂ زندگی کا نقشہ مکمل ہو گیا۔ "آئندہ" کا ساز نغمہ ریز ہو گیا۔

دفعتہً اُسے خیال آیا کہ کہیں چور آ جائیں تو میں کلسا لے کر بھاگو نگا کیونکر؟ اس نے امتحاناً کلسے کو بغل میں دبا لیا اور ایک سو قدم تک بے تحاشا دوڑا ہوا چلا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے پیر دل میں پر لگ گئے ہیں۔ اطمینان ہو گیا۔

انہیں منصوبوں میں رات ختم ہو گئی۔ سفیدۂ صبح نمودار ہو گیا۔ ہوا جاگی۔ سوئے ہوئے درخت بیدار ہوئے۔ چڑیاں گانے لگیں۔ ناگاہ مہادیو کے کانوں میں آواز آئی:۔

ست گر دت شیو دت داتا
رام کے چرن میں چت لاگا

یہ بول ہمیشہ مہادیو کے ورد زبان رہتا تھا۔ دن میں ہزاروں بار یہ الفاظ اس کی زبان سے نکلتے تھے۔ پر ان کی باطنی کیفیت نے اس کے دل پر کبھی اثر نہ کیا تھا۔ جیسے کسی باجے سے آواز نکلتی ہے۔ اسی طرح یہ پد اس کی زبان سے نکلتا تھا۔ بے معنی اور بے اثر اس کا دل بے برگ و بار اس ہوائے لطیف سے بے حس رہتا تھا لیکن اب اس میں پتیاں اور کونپلیں نکل آئی تھیں۔ اس ہوا سے جھوم اٹھا۔ محو ترنم ہو گیا۔

ایک طرف طلوع سحر کی معرفت خیز تنویر تھی۔ دوسری طرف دریا کا روحانی نغمہ اور سطح آب کا عارفانہ سکون۔ فضائے محیط ایک نورانی راگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ عین اسی وقت طوطا شاخ بلند سے پروں کو جوڑے ہوئے اترا۔ جیسے آسمان سے کوئی تارا ٹوٹے اور آکر پنجرے میں بیٹھ گیا۔ مہادیو فرط مسرت سے دوڑا اور پنجرے کو اٹھا کر بولا۔ "آؤ آتما رام! اب تمہیں چاندی کے پنجرے میں رکھوں گا اور سونے سے مڑھ دوں گا۔" احسان اور تشکر سے اس کا

سینہ لبریز ہو گیا۔ پرماتما کتنا دیا دان ہے، کتنا بے کس نواز۔ یہ اُس کی عین رحمت ہے۔ ورنہ مجھ جیسا عاصی۔ سر تا پا گناہوں میں ڈوبا ہوا کب اس عطائے بیکراں کے قابل تھا؟ ہاں یہ اس کا فضل وکرم ہے۔ ان خیالات سے اس کا دل اُمڈ آیا۔ اس پر ایک سرور کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ ایک خود مستی کے عالم میں بول اٹھا:-

ست گرو دت شو دت داتا
رام کے چرن میں چت لاگا

اس نے ایک ہاتھ میں پنجرا لٹکایا۔ بغل میں کلسا دبایا گھر چلا

(۵)

جھادلیو اپنے مکان پر پہنچا تو ابھی کچھ اندھیرا تھا۔ گھر کے لوگ خوابِ سحر کا لطف اٹھا رہے تھے۔ راستے میں بجز ایک کتے کے اور کسی سے اس کی مڈبھیڑ نہ ہوئی اور کتے کو اشرفیوں سے کوئی خاص رغبت نہیں ہوتی۔ گھر پہنچتے ہی اس نے کلسے کو ایک مٹکی کی ناند میں چھپا دیا اور اسے کوئلہ سے اچھی طرح ڈھانک کر اس کو ٹھڑی میں رکھ دیا۔ جس میں اس کے اوزار اور نیم مرتب زیورات رکھے جاتے تھے جب ذرا دن نکل آیا تو وہ سیدھا پروہت جی کے مکان پر جا پہنچا پروہت جی پوجا پر بیٹھے ہوئے سوچ رہے تھے۔ کل ہی مقدمہ کی پیشی ہے اور ابھی تک روپیہ کی کوئی سبیل نہ کر سکا کیونکر کام

چلے گا۔ مجمانوں میں کوئی سانس ہی نہیں لیتا کہ اتنے میں مہادیو نے پہنچ کر پالاگن کیا۔ پردہت جی نے اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ یہ اپنی منحوس صورت لے کر یہاں کیونکر آکھڑا ہوا؟ معلوم نہیں آج دانہ بھی میسر ہوگا یا نہیں۔ کچھ ترش ہو کر پوچھا۔ "کیا ہے جی! کیا کہتے ہو! کیا جانتے نہیں کہ ہم اس وقت پوجا پر رہتے ہیں؟" مہادیو نے کہا۔ "مہاراج آج میرے یہاں ستیہ نارائن کی کتھا ہے۔"

پروہت جی متحیر ہو گئے۔ انہیں اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ مہادیو کے گھر کتھا کا ہونا اتنی ہی غیر معمولی بات تھی جتنی اپنے گھر سے کسی نابکاری کے لیے بھیک کا نکلنا۔ پوچھا۔ "آج کیا ہے؟"

مہادیو بولا۔ "کچھ نہیں۔ ایسا ہی جی میں آیا کہ آج بھگوان کی کتھا سن لوں۔"

صبح ہی سے تیاریاں ہونے لگیں۔ بیدو اور قریب وجوار کے دوسرے موضعوں میں نوید پھری۔ ہر کس و ناکس خاص و عام کی دعوت تھی۔ جو سنتا تھا۔ تعجب کرتا تھا۔ لیکن تیاریاں اتنے وسیع پیمانہ پر ہو رہی تھیں کہ کسی کو شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہ تھی۔ شام کو جب سب لوگ جمع ہو گئے اور پنڈت جی آکر سنگھاسن پر رونق افروز ہوئے تو مہادیو کھڑا ہو کر بلند آواز سے بولا۔ "بھائیو! میری ساری عمر چھل کپٹ میں بیت گئی۔ میں نے نہ جانے کتنے آدمیوں کو دغا دی۔ کتنا کھرے کو کھوٹا کیا۔ یہاں تک کہ آپ لوگ صبح کو میرا منہ دیکھتے ہوئے

ڈرتے تھے۔ پر اب بھگوان نے مجھ پر دیا کی ہے۔ وہ میرے منہ کے
کالک کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ میں آپ سب بھائیوں سے للکار کر
کہتا ہوں کہ جس کا میرے جمّے کچھ نکلتا ہو۔ جس کی جمع میں نے مار لی ہو
جس کے گہنے دبا لیے ہوں۔ جس کے چوکھے مال کو کھوٹا کر دیا ہو۔ وہ
اپنے ایمان دھرم سے آکر مجھ سے اپنی ایک ایک کوڑی بھر کا لیے اگر
کوئی یہاں نہ آسکا ہو تو آپ لوگ اس سے کہہ دیجئے کہ وہ کل سے
ایک مہینے تک جب جی چاہے آدمے اور اپنا حساب چکتا کر لے۔
کوئی گواہی ساکھی درکار نہیں۔ بس لوگ اپنے ایمان دھرم سے جو کچھ
کہہ دیں گے وہ بین نکالی کر دے دوں گا۔"

اس تقریر نے مجمع پر سکوت کی کیفیت طاری کر دی۔ سرگوشیاں
ہونے لگیں۔ کوئی پُر معنی انداز سے سر ہلا کر کہتا تھا "ہم کہتے نہ تھے؟"
کوئی حاسدانہ انداز سے کہتا تھا "کوئی دفینہ ہاتھ آگیا!" کوئی بدگمانی
سے کہتا تھا۔ "کیا کھا کے دے گا۔ ہزاروں کا ٹوٹل ہو جائے گا۔"
ایک زندہ دل ٹھٹھا کرتے مسکرا کر مہادیو سے پوچھا۔ "اور جو
لوگ مر گئے؟"

مہادیو نے جواب دیا "ان کے گھر والے تو ہونگے وہ آکر ایمان
دھرم سے جو کچھ نکلتا ہو لے لیں۔"
مگر اس وقت کسی کو وصولی کی اتنی فکر نہ تھی جتنی یہ جاننے کی کہ
اسے اتنے روپے مل کہاں سے گئے۔ کچھ دیر تک یہی عالم سکوت

رہا۔ لوگ ایک دوسرے کا منھ تاکتے تھے۔ ہر کسی کو مہادیو کے پاس آنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ دیہات کے آدمی تھے جس نقصان کو ایک بار پھر صبر کر چکے اس کی یاد تازہ کرنا ان کا خاصہ نہ تھا۔ پھر اکثر آدمیوں کو یاد بھی نہ تھا کہ ان کا کتنا نقصان ہوا اور ایسے مقدس موقع پر غلط بیانی کا خوف ان کی زبان بند کیے ہوئے تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مہادیو کی صوہمتی اور نیک نیتی نے انہیں مرعوب کر لیا تھا۔ بحر سکوت میں ایک موج بھی نہ اٹھی۔ دفعتہً پروہت جی بولے۔ "تمہیں یاد ہے کہ میں نے تمہیں ایک کنٹھا بنانے کے لیے سونا دیا تھا اور تم نے کئی ماشے تول میں اڑا دیئے تھے۔ سونا بھی خراب کر دیا تھا؟"

مہادیو۔ ہاں یاد ہے آپ کا کتنا نقصان ہوا ہوگا؟

پروہت جی۔ پچاس روپیہ سے کم نہ ہوگا۔

مہادیو نے کمر سے دو اشرفیاں نکالیں اور جا کر پروہت جی کے سامنے رکھ دیں۔

پنڈت جی کی سخت گیری پر پھر سرگوشیاں ہونے لگیں۔ یہ ظلم ہے۔ زیادتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو چار روپے کا نقصان ہوا ہوگا اس کے پچاس روپیہ اینٹھ لیے۔ کچھ نارائن کا بھی ڈر نہیں ہے۔ بننے کو پنڈت پر نیت ایسی خراب! رام رام!!

ہر ایک دل میں مہادیو سے وہ ہمدردی پیدا ہو گئی جو عقیدت

سے مشابہ ہوتی ہے۔ اشرفیوں کی خوش آئند آواز نے بعض کمزور دلوں کو گدگدایا ضرور۔ پر عام ہمدردی اور خوف پشیمانی نے اس گدگدی کو سینہ ہی میں دبا دیا۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ پر ہزاروں نفوس کے مجمع میں ایک شخص بھی نہ کھڑا ہوا۔ تب مہادیو نے پھر کھڑے ہو کر کہا "یہ معلوم ہوتا ہے آپ لوگ اپنا اپنا حساب بھول گئے ہیں۔ اس لیے آج کتھا ہونے دیجیے میں ایک مہینہ تک آپ لوگوں کی راہ دیکھوں گا۔ اس کے بعد تیرتھ کرنے چلا جاؤں گا۔ آپ سب بھائیوں سے بنتی ہے کہ میرا ادھار کریں۔"

مہادیو کے چہرے پر ایک غیر معمولی جلال تھا اور انداز گفتگو میں ایک شان توقیر۔ کتھا شروع ہوئی اور ختم ہو گئی۔ مہادیو کی داد و دہش اور فیاضانہ سرگرمی نے لوگوں کی عقیدت کو احترام کی حد تک پہنچا دیا۔

مہادیو صبح سے شام تک اہل تقاضا کی راہ دیکھا کرتا۔ رات کو چوروں کے خوف سے نیند نہ آتی۔ اب وہ کام نہ کرتا۔ شراب کا چسکا بھی چھوٹا۔ ہاں سادھو فقیر جو دروازہ پر آجاتے۔ ان کی خاطر خواہ تواضع و تکریم کرتا۔ قرب و جوار میں اس کے بذل و ایثار کا شہرہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ پورا ایک مہینہ گزر گیا اور ایک دادخواہ بھی نظر نہ آیا۔ اب مہادیو کو اندازہ ہو گیا کہ دنیا میں کتنا تحمل کتنی

پاک ہمتی ہے۔ اب اُسے معلوم ہوا کہ دنیا بزدلوں کے لیے بُری ہے۔ پر اچھوں کے لیے اچھی ہے۔

(۶)

اس واقعہ کو گزرے پچاس سال سے زائد ہو گئے۔ بنیدو میں آپ جائیے تو دور ہی سے ایک رفیع اور طلائی کنگرہ نظر آتا ہے۔ یہ ٹھاکر دوارہ کا کلس ہے۔ اس کے متصل ایک وسیع اور پختہ تالاب ہے۔ جس میں ہمیشہ کنول کھلے رہتے ہیں۔ اس کی مچھلیاں کوئی نہیں پکڑتا۔ تالاب کے کنارے ایک عالی شان مقبرہ ہے۔ یہی آتمارام کی یادگار ہے۔ اس جگہ وہ اپنے نقرئی پنجرے میں بیٹھے ہوئے محو خواب ہیں۔ اس کی نسبت مختلف روایتیں مشہور ہیں۔ کوئی کہتا ہے۔ وہ بیٹھے بیٹھے نظروں سے غائب ہو گئے۔ پر حقیقت یہ ہے کہ مہادیو تیرتھ سے واپس آیا تو ایک دن کسی گربۂ مسکین نے آتمارام کو لقمۂ دہن بنا لیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اب بھی آدھی رات کو تالاب کے کنارے آواز آتی ہے :-

ست گُردت شیو دت داتا

رام کے چرن میں چت لاگا

مہادیو کی نسبت بھی طرح طرح کے قصّے مشہور ہیں جن میں سب سے قرین قیاس یہ ہیں کہ وہ آتمارام کے قفس عنصری سے پرواز کرنے کے بعد چند سنیاسیوں کے ساتھ ہمالہ کی طرف چلے گئے۔ اور وہاں

سے واپس نہ آئے۔ ان کا نام آتمارام مشہور ہو گیا۔

اگلی گاؤں میں وہ بڈھے موجود ہیں جنہوں نے مہادیو کو آخری ایام میں دیکھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کا چہرہ پر جلال تھا اور ان کی زبان سے جو کچھ نکلتا۔ وہ ضرور پورا ہوتا تھا۔ ان کے کشف و کرامات کی صدہا داستانیں زبان زدِ خاص و عام ہیں۔

خدا کے کتنے گنہگار بندے محض ایک صدائے غیب کی بدولت محض ایک اتفاقی وجد کے اثر سے محض ایک الہامی تحریک سے درجہ کمال کو پہنچ گئے۔

بینک کا دیوالہ

لکھنؤ انڈسٹریل بینک کے وسیع دفتر میں لالہ سائیں داس آرام کرسی پر لیٹے ہوئے انوسٹرس ریویو کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اور سوچ رہے تھے۔ کہ اب کے معاملہ داروں کو منافع کہاں سے دیا جائے گا؟ چائے کوئلہ یا جوٹ کے حصے خریدنے یا چاندی سونے اور روئی کا سٹہ کرنے کا ارادہ کرتے۔ مگر نقصان کا اندیشہ کوئی فیصلہ قائم نہ ہونے دیتا تھا۔ غلہ کے کاروبار میں اب کے بڑا خسارہ رہا۔ حصہ داروں کی تشفی و اطمینان کے لیے فرضی حسابات تیار کرنا پڑے۔ اور منافع اصل روپیہ سے دینا پڑا۔ اس وجہ سے پھر غلہ کے کام میں ہاتھ ڈالتے ہوئے روح کانپتی تھی۔

مگر روپے کا بے کار رکھنا غیر ممکن تھا۔ دو ایک روز میں اس کے استعمال کی کوئی نہ کوئی صورت نکالنی لازمی تھی۔ کیونکہ ڈائریکٹروں کا سہ ماہی اجلاس ایک ہی ہفتہ

میں ہونے والا تھا۔ اور اگر اس وقت تک فیصلہ نہ ہو سکا۔ تو پھر آئندہ تین ماہ تک کچھ نہ ہو سکے گا۔ اور ششماہی تقسیم منافع کے موقع پر پھر وہی فرضی کاروائی کرنا پڑے گی جس کا متواتر متحمل ہونا بینک کے لیے دشوار تھا۔ بہت دیر تک اس خلجان میں پڑے رہنے کے بعد سائیں داس نے گھنٹی بجائی۔ اور بغل کے دوسرے کمرے سے ایک بنگالی بابو نے سر نکال کر جھانکا۔

سائیں داس۔ ٹاٹا اسٹیل کمپنی کو ایک خط لکھ دیجیئے۔ کہ وہ اپنا حال کا بیلنس شیٹ بھیج دیں۔

بابو۔ ان لوگوں کو روپیہ کا گرج نہیں۔ چھٹی کا جواب نہیں دیتا۔

سائیں داس۔ اچھا ناگپور کے سودیشی مل کو لکھئے۔

بابو۔ اس کا کاروبار اچھا نہیں ہے۔ ابھی اس کے مجوروں نے ہڑتال کیا تھا دو مہینہ تک مل بند رہا۔

سائیں داس۔ اجی تو کہیں لکھو بھی۔ تمہارے خیال میں تو ساری دنیا بے ایمانوں سے بھری ہوئی ہے۔

بابو۔ بابا لکھنے کو تو ہم سب جگہ لکھ دیں۔ مگر کھالی لکھ دینے سے کچھ فائدہ تو نہیں ہوتا۔

لالہ سائیں داس اپنے خاندانی رسوخ کے باعث بینک کے مینجنگ ڈائرکٹر ہو گئے تھے۔ مگر کاروباری دنیا سے بہت واقفیت نہ رکھتے تھے۔ یہی بنگالی بابو ان کے مشیر خاص تھے۔ ان بابو صاحب کو کسی کارخانہ یا کمپنی پر اعتماد نہ تھا۔ انہیں کی بزدلانہ احتیاط کے باعث پچھلے سال بینک کا روپیہ صندوق سے باہر نہ نکل

سکا تھا۔ اور اب وہی صورت درپیش تھی۔ سائیں داس کو اس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی تدبیر نہ سوجھتی تھی۔ اور نہ اتنی ہمت تھی کہ اپنی ذمہ داری پر کسی کاروبار میں بے خوف ہو کر کود پڑیں۔ پریشانی کے عالم میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے کہ دربان نے آکر خبر دی۔ کہ "برہل کی رانی صاحبہ کی سواری آئی ہے"۔

(۲)

لالہ سائیں داس چونک پڑے۔ برہل کی رانی صاحبہ کو لکھنؤ آئے تین چار دن ہوئے تھے۔ اور ہر ایک زبان پر انہیں کے چرچے تھے کوئی ان کی سادگی اور نفاست پر قربان تھا۔ کوئی ان کے حسنِ صورت پر، کوئی ان کی آزادروی پر، یہاں تک کہ ان کی کنیزیں، باڈی گارڈ، سپاہی وغیرہ بھی اس عام توجہ میں شریک تھے۔ رائل ہوٹل کے دروازے پر تماشائیوں کا ایک ہجوم سا لگا رہتا۔ کتنے ہی دیدہ ناز بے فکر لوگ، عطر فروش، بزاز، تمباکو گر وغیرہ کارد پ بھر بھر کے ان کی خدمت میں باریاب ہو چکے تھے۔ جس طرف سے رانی صاحبہ کی سواری نکل جاتی تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ کھڑے ہو جاتے تھے۔ واللہ کیا شان ہے۔ ایسی عراقی جوڑی لاٹ صاحب کے سوا اور کسی راجہ رئیس کے ہاں تو شاید ہی نکلے۔ اور کیا سجاوٹ ہے! سبحان اللہ ایسے گورے چٹے آدمی تو یہاں کبھی نظر نہیں آتے۔ یہاں تو روسا بیضہ مرغ، کشتۂ سنگرف اور مار اللحم اور خدا جانے کیا کیا خاک بلا کھاتے رہتے ہیں۔ پر کسی کے چہرے پر سرخی یا تازگی کا نام نہیں۔ یہ لوگ نہ جانے کیا کھاتے ہیں۔ اور کس کنوئیں کا پانی پیتے ہیں۔ کہ جسے دیکھئے تازہ سیب بنا ہوا ہے۔ یہ سب آب و ہوا کی برکت ہے۔

برہل شمال کی طرف نیپال کے قریب انگریزی عملداری میں ایک ریاست تھی۔ اور اگرچہ اس کے محاصل کی نسبت عوام میں مبالغہ آمیز روایتیں مشہور تھیں۔ مگر فی الواقع اس ریاست کی آمدنی دو لاکھ سالانہ سے زائد نہ تھی۔ ہاں اس کا رقبہ بہت وسیع تھا۔ زمین زیادہ تر غیر آباد تھی۔ آباد حصہ بھی کوہستانی اور کم زراعت تھا۔ زمین بہت سستی اٹھتی تھی۔

لالہ سائیں داس نے فوراً الگنی سے اتار کر ریشمی سوٹ پہن لیا۔ اور میز پر آکر اس شان سے بیٹھ گئے۔ گویا راجہ رانیوں کا یہاں آنا غیر معمولی بات نہیں ہے۔ دفتر کے کلرک بھی ہوشیار ہو گئے۔ سارے بینک میں وہ خاموش ہل چل پیدا ہو گئی۔ جو ہمیشہ غیر معمولی آمدوں کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے۔ دربان نے پگڑی سنبھالی۔ چوکیدار نے تلوار نکالی۔ اور اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ پنکھا قلی بھی خوابِ خرگوش سے چونکا۔ اور بنگالی بابو رانی صاحبہ کی پیشوائی کے لیے دفتر سے باہر نکلے۔

سائیں داس نے بے نیازی کی شان تو بنا رکھی تھی۔ مگر دل امید و بیم سے کانپ رہا تھا۔ ایک والئی ملک سے معاملہ کرنے کا یہ پہلا سابقہ تھا۔ گھبراتے تھے کہ بات کرتے بنے یا نہ بنے۔ رئیسوں کا مزاج عرش پر ہوتا ہے۔ معلوم نہیں میری کون سی بات ناگوار گزرے۔ انہیں اس وقت اپنے میں ایک خامی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ والیانِ ملک کے آدابِ مجلس سے واقف نہ تھے۔ ان کی تعظیم کس انداز سے ہونی چاہیے۔ ان سے ہمکلام ہونے میں کس قسم کا لحاظ کرنا چاہیے۔ ان کے حفظِ مراتب کے لیے کس حد تک انکسار مناسب ہے۔ اس قسم کے سوالات انہیں سخت تشویش ہو رہی تھی۔ اور جی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس امتحان سے جلد نجات ہو

جائے۔ تاجروں اور معمولی زمینداروں یا رئیسوں سے معاملہ کرنے میں وہ بے رعایت صفائی کا برتاؤ کیا کرتے تھے۔ اور تعلیمیافتہ معزز آدمیوں سے اخلاق اور شرافت کا۔ ان موقعوں پر انہیں کسی مزید احتیاط کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس وقت انہیں وہ پریشانی ہو رہی تھی۔ جو لنکا کے کسی باشندے کو تبت میں ہو۔ جہاں کے رسم ورواج رفتار و گفتار کا اسے علم نہ ہو۔

دفعتہً ان کی نگاہ گھڑی پر پڑی۔ سہ پہر کے چار بج چکے تھے۔ پر گھڑی ابھی قیلولہ کر رہی تھی۔ تاریخ کی سوئی نے تیز روی میں وقت کو مات کر دیا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھے کہ گھڑی کو ٹھیک کر دیں۔ کہ اتنے میں رانی صاحبہ نے کمرے میں قدم رکھا۔ سائیں داس نے گھڑی کو چھوڑا۔ اور رانی صاحبہ کے قریب پہلو میں کھڑے ہو گئے۔ تصفیہ نہ کر سکے کہ ہاتھ ملاؤں۔ اس فردِ گزاشت کا اثر ایک اضطراب کی صورت میں ان کے چہرے پر نمودار ہو گیا۔ بارے رانی صاحبہ نے خود ہاتھ بڑھا کر انہیں اس الجھن سے نجات دی۔

رانی صاحبہ کا لباس بہت سادہ تھا۔ جُثہّ نحیف، اس رعب اور تحکم کا شائبہ بھی نہ تھا۔ جو ثروت کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان کی بڑی بڑی آنکھوں سے ایک بے کسی کی سی جھلکتی تھی۔ چہرہ درد اور التجا کی تصویر تھا۔ اس پر حسرت کا وہ شوخ رنگ تھا جو دوسروں کو جبراً رعایت، احسان، اعانت پر مائل کرتا تھا۔ کوئی انسان جس کے پہلو میں دل ہو۔ اس کے جادو سے بے اثر نہ رہ سکتا تھا۔ ایک پیکر تالیف تھا۔ جس پر حسن و یاس کی تاثیر منقوش تھی۔ شام غم تھی۔ خاموش، زرد اور بے ہوا، ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا زمانہ کے جور وستم نے اس میں شکوۂ ستم کی آرزو بھی نہیں

باقی رکھی۔ جذبات دل فنا ہو گئے۔ اور تسلیم و توکل کے سوا اور کوئی سہارا باقی نہیں رہا۔

جب لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تو رانی کے پرائیویٹ سیکرٹری نے معاملہ کی بات چیت شروع کی۔ پہلے برہل کی پرانی عظمت کا قصہ کہنے کے بعد اس نے ان ترقیوں کا ذکر کیا۔ جو رانی صاحبہ کی ذات سے عمل میں آئیں۔ چنانچہ فی الحال نہروں کی ایک شاخ نکالنے کے لیے دس لاکھ روپیہ کی ضرورت درپیش تھی۔ اور باوجودیکہ رانی صاحبہ کسی انگریزی بینک سے معاملہ کر سکتی تھیں۔ مگر انہوں نے ایک ہندوستانی بینک کے حق کو مرجح سمجھا۔ اب یہ فیصلہ انڈسٹریل بینک کے اختیار میں تھا کہ وہ اس موقعہ سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے یا نہیں۔

بنگالی بابو۔ ہم روپیہ دے سکتا ہے۔ مگر کاغذ پتر دیکھے بنا کچھ نہیں کر سکتا۔

سیکرٹری۔ آپ کوئی ضمانت چاہتے ہیں۔؟

سائیں داس۔ (فیاضانہ انداز سے بولے) جناب ضمانت کے لیے آپ کی زبان کافی ہے۔

بنگالی بابو۔ آپ کے پاس ریاست کا کوئی حساب کتاب ہے؟

لالہ سائیں داس کو اپنے ہیڈ کلرک کی یہ دنیاداری سخت گیری ناگوار گزری۔ وہ اس وقت فیاضی کے نشہ میں مخمور تھے۔ رانی صاحبہ کی صورت التجا کافی ضمانت تھی۔ ان کے سامنے کاغذ اور حساب کا ذکر کرنا نابیناپن معلوم ہوتا تھا جس سے بے اعتباری کی بو آتی ہے۔ انہیں اس وقت حساب کتاب کا ذکر سفلہ پن معلوم ہو رہا تھا۔ صنفِ لطیف کے سامنے ہم فیاضی اور شرافت کے پتلے بن جاتے ہیں۔

بنگالی بابو کی طرف کڑی نگاہ سے دیکھ کر بولے۔ کاغذات کی جانچ کوئی لازمی امر نہیں ہے۔ شرط صرف ہمارا اطمینان ہے"۔

بنگالی بابو۔ ڈائریکٹر لوگ کبھی نہ مانے گا۔

سائیں داس۔ ہم کو اس کی پروا نہیں۔ ہم اپنی ذمہ داری پر روپے دے سکتے ہیں۔

رانی نے سائیں داس کی طرف نگاہِ تشکّر سے دیکھا۔ ان کے ہونٹوں پر ایک خفیف سا تبسّم نظر آیا۔ اس میں کچھ کامیابی کی مسرت تھی۔ کچھ صیّاد کی سفاکی۔ اور کچھ سودائے خام کی حقارت۔

(۳)

مگر ڈائریکٹروں نے حساب کتاب، آمدنی اور خرچ دیکھنا ضروری سمجھا۔ اور یہ کام لالہ سائیں داس کے سپرد ہوا۔ کیونکہ کسی اور کو اپنے کاموں سے اتنی فرصت نہ تھی۔ کہ ایک پورے دفتر کا معائنہ کرتا۔ سائیں داس نے ضابطہ کی پابندی کی۔ تین چار دن تک کاغذات جانچتے رہے۔ اور اپنے اطمینان کی رپورٹ پیش کی۔ معاملہ طے ہو گیا۔ دستاویز مرتب ہوئی۔ روپیہ دیا گیا۔ شرح سود نو فیصدی قرار پایا۔

تین سال تک بینک کے کاروبار کو خوب فروغ ہوا۔ چھٹے مہینے بے طلب و تقاضا ۴۵ ہزار کی رقم یکمشت دفتر میں آجاتی تھی۔ معاملہ داروں کو پانچ فیصدی منافع دے دیا جاتا تھا۔ حصہ داروں کو ۷ فیصدی، اس طرح اس نفع کی کسر پوری ہو جاتی تھی۔ جو دوسرے وسائل سے حاصل ہوتا تھا۔ سائیں داس سے سب لوگ

خوش تھے۔ سب ان کی معاملہ فہمی کے مداح، یہاں تک کہ بنگالی بابو بھی رفتہ رفتہ ان کے قائل ہوتے جاتے تھے۔ سائیں داس ان سے کہا کرتے "بابو جی! اعتبار دنیا سے کبھی عنقا ہوا ہے۔ اور نہ ہو گا۔ نیکی پر عقیدہ رکھنا ہر ایک انسان کا فرض ہے۔ جس شخص کے دل سے یہ عقیدہ اٹھ جاتا ہے۔ اسے زندہ درگور سمجھنا چاہیئے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ میں چاروں طرف سے دشمنوں سے گھرا ہوں۔ بڑے سے بڑا کامل فقیر اسے رنگا ہوا سیار معلوم ہوتا ہے۔ سچے سے سچا محب وطن اسے بندۂ شہرت نظر آتا ہے۔ اسے دنیا دغا اور فریب سے پر دکھائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے دل سے پرماتما کی عزت اور عظمت غائب ہو جاتی ہے۔ ایک مشہور فلاسفر کا قول ہے کہ ہر ایک انسان کو شریف سمجھو۔ تاوقتیکہ اس کے خلاف کوئی صریح ثبوت نہ ہو۔ موجودہ قوانین سیاست اسی معرکتہ الآرا اصول پر قائم ہیں۔ اور نفرت تو کسی سے کرنی ہی نہ چاہیئے۔ ہماری روحیں پاک ہیں۔ ان سے نفرت کرنا پرماتما سے نفرت کرنے کے برابر ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ دنیا میں دغا اور فریب نہیں ہے ہے اور بہت کثرت سے ہے۔ مگر اس کا علاج بدگمانی نہیں۔ قیافہ شناسی ہے۔ اور یہ خاص عطیہ ہے۔ جو ایشور کے دربار سے خاص خاص آدمیوں کو عطا ہوتا ہے۔ میں اس کا دعویٰ نہیں کرتا۔ پر مجھے یقین ہے کہ انسان کی صورت دیکھ کر میں اُس کے ضمیر کی تہ تک پہنچ جاتا ہوں۔ کوئی کتنا ہی بھیس بدلے۔ رنگ روپ بھرے۔ پر میری نگاہ باطن کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ یہ بھی خیال رکھیئے۔ کہ اعتبار سے اعتبار پیدا ہوتا ہے۔ اور بے اعتباری سے بے اعتباری۔ یہ فطرت کا قانون ہے۔ جس شخص کو ابتداء ہی سے شاطر، حریف، فتنہ باز سمجھ لیں گے۔ وہ کبھی آپ سے صفائی اور خوش

معاملگی نہ برتے گا۔ وہ ضدًا آپ کو زک دینے کی کوشش کرے گا۔ اس کے برعکس آپ ایک چور پر بھی اعتماد کریں۔ تو وہ آپ کا غلام ہو جائے گا۔ ساری دنیا کو لوٹے۔ پر آپ کو دغا نہ دے گا۔ وہ کتنا ہی بدکار سیاہ کار حرام کار کیوں نہ ہو۔ پر آپ اس کے گلے میں اعتبار کی زنجیر ڈال کر اسے جس طرف چاہیں لے جا سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ آپ کے ہاتھوں میں نیکی کا آلہ بن سکتا ہے"۔

بنگالی بابو کے پاس ان فلسفیانہ دلیلوں کا کوئی جواب نہ تھا۔

(۴)

چوتھے سال کی پہلی ششماہی کی آخری تاریخ تھی۔ لالہ سائیں داس بینک کے دفتر میں بیٹھے ہوئے ڈاکیے کی راہ دیکھ رہے تھے۔ آج بریل سے پینتالیس ہزار روپیہ آئیں گے۔ اس لیے ششماہی منافع کا تخمینہ مرتب کر چکے تھے۔ اب کے ان کا ارادہ تھا کہ کچھ فرنیچر اور خریدیں۔ اب تک بینک میں ٹیلی فون نہیں تھا۔ اس کا تخمینہ بھی طلب کر لیا تھا۔ امید کی مسرت چہرہ پر جھلک رہی تھی۔ مذاقاً کبھی بنگالی بابو سے کہتے۔ اس تاریخ کو میرے ہاتھوں میں خواہ مخواہ کھجلی ہونے لگتی ہے۔ آج بھی ہتھیلی کھجلا رہی ہے"۔ کبھی دفتری سے کہتے۔ "ارے میاں شفقت ذرا استخارہ تو کرو۔ محض سود ہی سود آرہا ہے۔ یا دفتر والوں کے لیے کچھ نذرانہ شکرانہ بھی ہے"۔ امید کا اثر شاید در و دیوار پر بھی ہوتا ہے۔ بینک آج شگفتہ نظر آتا تھا۔

ڈاکیہ عین وقت پر آیا۔ سائیں داس نے ایک شان استغنا سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے تھیلے سے کئی رجسٹرڈ لفافے نکالے۔ سائیں داس نے ان لفافوں

کو اڑتی ہوئی نگاہ سے دیکھا۔ بریل کا کوئی لفافہ نہ تھا، نہ بیمہ، نہ مہر نہ وہ تحریر، کچھ مایوسی سی ہوئی۔ جی میں آیا ڈاکیے سے پوچھیں۔ کوئی اور رجسٹری رہ تو نہیں گئی۔ پر ضبط کیا، دفتر کے کلرکوں کے روبرو اتنی بے صبری شان کے خلاف تھی۔ مگر جب ڈاکیہ چلنے لگا۔ تو ان سے رہا نہ گیا۔ پوچھ ہی بیٹھے۔ "ارے بھئی کوئی بیمہ شدہ لفافہ رہ تو نہیں گیا؟ آج سے اُسے آنا چاہیے تھا۔" ڈاکیے نے کہا "سرکار بھلا ایسی بات ہے اور کہیں بھول چوک ہو جائے۔ پر حضور کے کام میں ایسی بھول ہو سکتی ہے۔"

سائیں داس کا چہرہ اتر گیا۔ جیسے کچے رنگ پر پانی پڑ جائے۔ ڈاکیہ چلا گیا۔ تو بنگالی بابو کی طرف خطاوار نگاہوں سے دیکھ کر بولے "یہ دیر کیوں ہوئی؟ پہلے تو کبھی ایسا نہ ہوتا تھا۔"

بنگالی بابو نے ناہمدردانہ انداز سے جواب دیا۔ کسی سبب دیری ہو گیا ہو گا۔ گھبرانے کا کوئی بات نہیں ہے۔

مایوسی محال کو ممکن بنا دیتی ہے۔ سائیں داس کو اس وقت یہ خیال ہوا کہ شاید پارسل سے روپے آتے ہوں۔ ہو سکتا ہے۔ تین اشرفیوں کو پارسل کر دیا ہو۔ اگرچہ وہ کسی سے اس خیال کو ظاہر کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ پر انہیں یہ امید اس وقت تک لگی رہی۔ جب پارسل والا پوسٹ مین واپس نہ گیا۔ آخر شام کو وہ ایک پریشانی کی حالت میں اُٹھ کر گھر چلے گئے۔ اب خط یا تار کا انتظار تھا۔ دو تین بار جھنجھلا کر اٹھے۔ کہ ڈانٹ کر ایک خط لکھوں۔ اور صاف صاف کہہ دوں۔ کہ ایسے معاملات میں وعدہ خلافی سخت معاملگی کا ثبوت دیتا ہے۔ ایک دن کی تاخیر بھی بینک کے لیے مہلک ہو سکتی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ ایسی شکایت کا موقع نہ ملے گا۔

مگر پھر کچھ سوچ کر نہ لکھا۔

شام ہو گئی تھی۔ کئی احباب آ گئے۔ گپ شپ ہونے لگی۔ کہ پوسٹ مین نے آ کر شام کی ڈاک سائیں داس کو دی۔ یوں وہ پہلے اخبار کو کھولا کرتے تھے۔ پر آج چٹھیاں کھول لیں۔ مگر برہل کا کوئی خط نہ تھا۔ تب بے دلی کے ساتھ ایک انگریزی اخبار کھولا۔ اور پہلے ہی تار کا عنوان دیکھ کر ان کا خون سرد ہو گیا۔

"کل شام کو رانی صاحبہ برہل نے تین دن کی بیماری کے بعد وفات پائی"۔

اس کے آگے ایک مختصر نوٹ میں یہ مضمون درج تھا۔

"رانی صاحبہ برہل کی مرگ بے ہنگام صرف اس ریاست کے لیے نہیں بلکہ کل صوبے کے لیے ایک افسوس ناک سانحہ ہے۔ حکمار حاذق مرض کی تشخیص بھی نہ کر سکے تھے، کہ موت نے قصہ تمام کر دیا۔ رانی صاحبہ کو اپنی ریاست کی بہتری کا خیال ہمیشہ مدِ نظر رہتا تھا۔ ان کے مختصر دوران حکومت میں ان کی ذات سے ریاست کو جو فیوض حاصل ہوئے ہیں۔ وہ عرصہ تک یادگار رہیں گے۔ اگرچہ یہ مسلّمہ امر تھا۔ کہ ریاست ان کے بعد دوسرے ہاتھوں میں جائے گی۔ مگر یہ خیال رانی صاحبہ کے ادائے فرض میں کبھی مخل نہ ہوا۔ قانوناً انہیں ریاست کی کفالت پر کسی قسم کے مالی معاملہ کرنے کا مجاز نہ تھا۔ مگر رعایا کے فلاح و اصلاح نے کئی موقعوں پر اس اس پابندی کو نظر انداز کرنے پر مجبور کیا۔ ہم کو یقین ہے کہ اگر ان کی زندگی نے چند سال اور وفا کی ہوتی۔ تو ریاست ان کفولیتوں سے سبکدوش ہو جاتی۔ انہیں شب و روز اس کی فکر تھی۔ قانونی پیچیدگیوں سے مغالطہ دینے کا گمان انہیں کبھی نہیں ہوا۔ مگر بے وقت موت نے اب یہ فیصلہ دوسرے ہاتھوں میں دے دیا ہے۔ دیکھنا چاہیے۔ ان کفولیتوں کا کیا

حشر ہوتا ہے۔ ہمیں معتبر وسائل معلوم ہوا ہے۔ کہ نئے راجہ صاحب نے جو آج کل لکھنؤ میں رونق افروز ہیں۔ اپنے وکلار کے مشورے کے مطابق مرحومہ کی مالی موخذات سے انکار کر دیا ہے۔ ہمیں خوف ہے کہ عنقریب لکھنؤ کے مالی حلقے میں ایک زبردست ہل چل پیدا ہوگی۔ اور کتنے ہی اصحاب زر کو سبق مل جائے گا۔ کہ سود کی ہوس حزم واحتیاط کی قیدیوں سے آزاد ہو کر کتنی مضرت کا باعث ہوتی ہے۔

لالہ سائیں داس نے اخبار میز پر رکھ دیا۔ اور آسمان کی طرف تاکا۔ جو مایوسی کا آخری سہارا ہے۔ دوسرے احباب نے یہ خبر پڑھی۔ تاہم اس مسئلہ کے قانونی پہلو پر گفتگو ہونے لگی۔ نوبت تکرار و حجت تک پہنچی۔ سائیں داس پر چاروں طرف سے بوچھاڑ پڑنے لگی۔ سارا الزام ان کے سر منڈھا گیا۔ اور ان کی ایک مدت کی کاردانی، معاملہ فہمی اور مال اندیشی تک خاک میں مل گئی۔ بینک کے لیے اتنا زبردست نقصان برداشت کرنا غیر ممکن تھا اور اب یہ مسئلہ درپیش تھا۔ کہ اس کا وجود کیونکر قائم رہے۔

(۵)

اس کے بعد ہفتوں تک متواتر صبح سے شام تک بینک میں بازکشی معاملہ داروں کا تانا لگا رہتا۔ جن لوگوں کی رقمیں بغیر مدت کی قید کے جمع تھیں۔ وہ اف کی واپسی پر بہ ضد تھے۔ اور کوئی عذر نہ سنتے تھے۔ معلوم نہیں یہ اسی اخبار کے نوٹ کا اثر تھا یا رقیبوں کی خفیہ ریشہ دوانیوں، کہ انڈسٹریل بینک کے خلاف سارے شہر میں بدگمانی پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں شک نہیں۔ کہ اگر لوگ صبر سے کام لیتے، تو ایسی صورتیں پیدا ہو جاتیں۔ کہ بینک اس صدمہ سے جانبر ہو جاتا۔ مگر شورش اور

طوفان میں کون سی کشتی ساکت رہ سکتی ہے؟ آخر خزانچی نے انکاری جواب دینے شروع کیے
بینک کی رگوں سے خون کی اتنی دھاریں نکلیں کہ وہ بے جان ہو گیا۔

دو ماہ گزر گئے تھے۔ احاطہ میں ہزاروں سوداگران بینک جمع تھے۔ مگر مرنے والے کی آنکھیں بند تھیں۔ نبض ساکت، زبان خاموش، آہ و بکا کی دلدوز صدائیں اٹھ رہی تھیں۔ پر یہ صدائے ماتم اس کے کانوں تک نہ پہنچتی تھی۔ بینک کے دروازے پر مسلح سپاہیوں کا پہرہ تھا۔ دم دم پر طرح طرح کی افواہیں اڑتی تھیں۔ اور ہر ایک افواہ میں اس مجمع کثیر کو ہمہ تن گوش و ہمہ تن چشم بنا دیتی تھی۔ کبھی خبر اڑتی تھی، کرالہ سائیں داس نے زہر کھا لیا، کوئی ان کی گرفتاری کی خبر لاتا تھا۔ کوئی کہتا تھا۔ ڈائریکٹر صاحبان زیر حراست ہو گئے۔

اور یہ کیفیت احاطہ ہی تک محدود نہ تھی۔ شہر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ رونے والوں سے زیادہ دردناک حالت ان کی تھی جن کی آنکھیں شرمندۂ غم نہ ہو سکتی تھی جنہیں خاندانی وقار خودداری پر مجبور کیے ہوئے تھا۔

آفتاب غروب ہو گیا۔ صبر میں انتظار کی طاقت نہ رہی۔ ڈوبنے والے آفتاب کی طرح وہ بھی مایوسی کی تاریکی میں ڈوب گیا۔ مجمع رفتہ رفتہ کم ہونے لگا۔ دفعتہً سڑک پر سے ایک موٹر نکلا۔ اور بینک کے سامنے آ کر رک گیا۔ کسی نے کہا، برہل کے راجہ صاحب کا موٹر ہے۔ اتنا سنتے ہی سینکڑوں آدمی وحشت کے عالم میں موٹر کی طرف دوڑے۔ مگر شکوۂ بے داد کے لیے نہیں۔ صرف اس شخص کی صورت دیکھنے کے لیے جو ان کی کشتِ امید کا سترہ تھا۔ جس کے ہاتھوں ان کی قسمتیں پامال ہو رہی تھیں۔
نوجوان کنور جگدیش سنگھ رانی صاحبہ کی وفات کے بعد وکیلوں سے قانونی شدہ

لینے کے لیے لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ رئیسانہ نوازمات کی خریدبھی ضروری تھی وہ آرزوئیں جو ایک مدت سے اسی موقع کی منتظر تھیں۔ اب بندھے ہوئے پانی کی طرح راہ پا کر اُبلی پڑتی تھیں۔ یہ موٹر آج ہی لیا تھا۔ شہر میں ایک بنگلہ کے متعلق بات چیت ہو رہی تھی۔ بیش قیمت فرنیچر اور شیشہ آلات کی ایک گاڑی بریل روانہ ہو چکی تھی۔ انگریزی جوہری بھی ان کی قدر دانیوں سے محروم نہ تھے۔ ارباب نشاط کی مجلسیں مردانہ آراستہ ہوتیں۔ یہاں سے فرصت ملتی تو تھیٹر کی باری آتی۔ چڑیا قفس سے آزاد ہو کر ہر ایک ڈالی پر چہکتی پھرتی تھی۔ یہ مجمع دیکھا۔ تو خیال کیا کہ کوئی نیا تماشا ہونے والا ہے۔ موٹر روک دیا۔ کہ اتنے میں صدہا آدمیوں نے آکر موٹر کو گھیر لیا۔

کنور صاحب نے پوچھا "یہاں آپ لوگ کیسے جمع ہیں۔ کوئی تماشا ہونے والا ہے کیا؟"

ایک صاحب جو وضع سے کوئی بگڑے رئیس معلوم ہوتے تھے، بولے "جی ہاں بڑا دلچسپ تماشا ہے"۔

کنور۔ "کس کا تماشا ہے"؛

"قسمت کا"

کنور صاحب کو اس جواب پر حیرت تو ہوئی، مگر سُنتے آئے تھے۔ کہ لکھنؤ والے بات بات پر شاعری کیا کرتے ہیں۔ اس لیے اسی انداز سے جواب دینا بھی ضروری معلوم ہوا، بولے "قسمت کا تماشا دیکھنے کے لیے یہاں آنا تو ضروری نہیں"۔

لکھنوی حضرت نے فرمایا۔ جناب کا فرمانا بجا ہے۔ مگر دوسری جگہ یہ لطف

کہاں۔ یہاں آج صبح سے شام تک قسمت نے کتنوں ہی کو امیر سے غریب، اور کتنوں ہی کو غریب سے فقیر بنا دیا۔ جو لوگ محلوں میں بیٹھتے تھے، اس وقت انہیں درخت کی چھاؤں بھی میسّر نہیں۔ جن کے دروازے پر زکوٰۃ بٹتی تھی۔ اس وقت روٹیوں کو محتاج ہیں۔ ابھی تک ایک ہفتہ قبل جو لوگ شکوۂ روزگار اور نیرنگیٔ تقدیر اور جورِ فلک کو شاعرانہ استعارات سمجھا کرتے تھے۔ اس وقت ان کی آہ و زاری نالۂ عشق کو بھی شرمندہ کر رہی ہے۔ ایسے عبرت خیز تماشے اور کہاں دیکھنے میں آئیں گے۔

کنور صاحب اب اپنی حیرت کو نہ چھپا سکے۔ پوچھا، جناب آپ نے تو معمے کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا۔ میں دیہقانی آدمی ہوں۔ مجھ سے نثر میں بات کیجیے۔

اس پر ایک جنٹلمین نے فرمایا "حضرت یہ انڈسٹریل بینک ہے۔ اس کا دیوالہ ہو گیا ہے۔ آداب عرض ہے، بندہ کو پہچانا؟"

کنور صاحب نے ان کی طرف دیکھا تو موٹر سے اچھل پڑے۔ اور نیچے آ کر ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولے۔ "ارے مسٹر نسیم؟ تم یہاں کہاں؟ یار تم سے مل کر روح تازہ ہو گئی۔"

مسٹر نسیم کنور صاحب کے ساتھ ڈیرہ دون کالج میں پڑھتے تھے۔ دونوں ساتھ ساتھ ڈیرہ دون کی پہاڑیوں کی سیر کرنے جایا کرتے تھے۔ مگر جب سے کنور صاحب نے خاندانی حالات سے مجبور ہو کر کالج چھوڑا۔ دونوں دوستوں میں ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ نسیم بھی ان کے آنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد اپنے وطن لکھنؤ چلے آئے تھے۔

نسیم نے جواب دیا "شکر ہے، آپ نے پہچانا تو کہئے اب تو پو بارہ ہیں۔ کچھ

دوستوں کی بھی خبر ہے؟

کنور۔ یار مبالغہ نہیں، تمہاری یاد ہمیشہ آیا کرتی تھی۔ کہو آرام سے تو ہو؟ میں رائل ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ آج آؤ، تو اطمینان سے باتیں ہوں۔

نسیم۔ جناب اطمینان تو انڈسٹریل بینک کے ساتھ رخصت ہو گیا ہے۔ اب تو فکر معاش سر پر سوار ہے۔ جو کچھ جمع تھی، آپ کے نذر ہوئی۔ اس دیوالہ نے فقیر بنا دیا۔ اب آپ کے آستانوں پر دھرنا دوں گا۔

کنور۔ یار تمہارا گھر ہے، بے تکلف آؤ، میرے ساتھ ہی کیوں نہ چلو؟ کیا بتاؤں، مجھے مطلق معلوم نہ تھا۔ کہ میری دست کشی کا یہ اثر ہو گا۔ معلوم ہوتا ہے بینک نے بہتیروں کو تباہ کر دیا۔

نسیم۔ گھر گھر کہرام مچا ہوا ہے۔ میرے پاس اس جسم پر کے کپڑوں کے سوا اور کچھ نہیں رہا۔

استنے میں ایک تلک دھاری پنڈت جی آ گئے۔ اور بولے "مہاراج! آپ کے جسم پر کپڑے تو ہیں۔ یہاں تو دھرتی اکاش کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔ میں راگھو جی پاٹ سالا کا ادھیاپک ہوں۔ پاٹ سالا کا سب روپیہ اسی بینک میں جمع تھا۔ پچاس ودیارتھی۔ اس کی بدولت سنسکرت پڑھتے تھے۔ اور بھوجن پاتے تھے۔ کل سے پاٹ سالہ بند ہو جائے گا۔ دور دور کے ودیارتھی ہیں۔ وہ اپنے گھر کیسے پہنچیں گے۔ پرالیشور ہی جانے"!

ایک صاحب جن کے سر پر پنجابی وضع کی پگڑی تھی۔ گاڑھے کا کوٹ اور چمرودھا جوتا پہنے ہوئے تھے، آگے بڑھ آئے۔ اور ایک شان نیابت سے بولے

جناب اس بینک کے فیلیور نے کتنے ہی انسٹی ٹیوشنوں کا خاتمہ کر دیا۔ لالہ دینا ناتھ کا
یتیم خانہ ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔ اس کا ایک لاکھ روپیہ ڈوب گیا۔ ابھی پندرہ
دن ہوئے ہیں۔ ڈیپوٹیشن سے لوٹا۔ تو پندرہ ہزار روپے یتیم خانہ کے فنڈ میں جمع
کیے تھے۔ مگر اب کہیں کوڑی کا بھی ٹھکانا نہیں۔"

ایک کہن سال بوڑھے نے کہا۔ "صاحب میری تو عمر بھر کی کمائی مٹی میں مل گئی۔
اب کفن کا بھی بھروسہ نہیں۔"

رفتہ رفتہ اور لوگ جمع ہو گئے۔ اور عام گفتگو ہونے لگی۔ ہر شخص اپنے قریب
کے آدمی کو اپنی مصیبت کی داستان سنانے لگا۔ کنور صاحب آدھ گھنٹہ تک نسیم کے
ساتھ کھڑے یہ فسانۂ غم سنتے رہے۔ جوں ہی موٹر پر بیٹھے اور ہوٹل کی طرف چلنے کا
حکم دیا۔ ان کی نگاہ ایک خستہ حال آدمی کی طرف گئی۔ جو زمین پر سر جھکائے بیٹھا
تھا۔ یہ ایک اہیر تھا۔ کنور صاحب کے ساتھ بچپن میں کھیلا تھا۔ اس وقت ان
میں رتبہ کی یہ تمیز نہ تھی۔ کنور صاحب نے بار بار اس کی دھولیں کھائی تھیں۔ اس
کی گالیاں سنی تھیں۔ دونوں ساتھ کبڈی کھیلتے تھے۔ ساتھ پیڑوں پر چڑھ کر چڑیوں
کے بچے چراتے تھے۔ جب کنور صاحب ڈیرہ دون پڑھنے گئے۔ تو یہ اہیر کا لڑکا شیو
داس اپنے باپ کے ساتھ لکھنؤ چلا آیا جس نے یہاں ایک دودھ کی دکان کھول
لی تھی۔ کنور صاحب نے اسے پہچانا۔ اور زور سے پکارا۔ "ارے شیو داس؟ ادھر دیکھو
شیو داس ادھر دیکھو۔" شیو داس نے آواز سنی۔ مگر سر اوپر نہ اٹھایا۔ وہ اپنی
جگہ پر بیٹھا ہوا کنور صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ بچپن کے وہ دن یاد آ رہے تھے۔ جب
وہ جگدیش کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتا تھا۔ جب دونوں بڈھے غفور میاں کا ٹٹو چڑھا

کر گھر میں چھپ جاتے تھے۔ جب وہ اشارے سے جگدیش کو ماسٹر کے پاس سے بُلا لیا کرتا۔ اور دونوں رام لیلا دیکھنے چلے جاتے۔ اسے یقین تھا کہ کنور صاحب مجھے بھول گئے ہوں گے۔ وہ بچپن کی باتیں اب کہاں۔ کہاں میں اور کہاں وہ! لیکن جب کنور صاحب نے اس کا نام لے کر پکارا، تو بجائے اس کے کہ وہ خوش ہو کر ان سے ملے۔ اس نے اور بھی سر جھکا لیا۔ اور وہاں سے سرک جانا چاہا۔ کنور صاحب کا اخلاق اب اس خلیج پر حاوی نہیں ہو سکتا تھا۔ جو ان کے اور اس کے درمیان حائل تھی۔ مگر کنور صاحب اسے کھسکتے دیکھ کر موٹر سے اتر کر اس کے پاس آئے، اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔ "ارے شیو داس کیا مجھے بھول گئے؟"

شیو داس کو اس آواز میں پرانی بے تکلفی کا احساس ہوا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ کنور صاحب کے گلے سے لپٹ گیا۔ اور بولا! "بھولا تو نہیں۔ پر آپ کے سامنے آتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

کنور۔ یہاں دودھ کی دکان کرتے ہو کیا؟ مجھے معلوم ہی نہ تھا۔ نہیں تو ایک ہفتہ سے پانی پیتے پیتے زکام کیوں ہوتا؟ آؤ اس موٹر پر بیٹھ جاؤ۔ میرے ساتھ ہوٹل تک چلو، تم سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ تمہیں [illegible] لے چلوں گا۔ اور ایک بار پھر گلی ڈنڈا کھیلیں گے۔

شیو داس۔ ایسا نہ کیجیے، نہیں تو دیکھنے والے ہنسیں گے۔ ہوٹل میں آجاؤں گا۔ وہی حضرت گنج والے ہوٹل میں ٹھہرے ہیں نہ۔

کنور۔ ضرور آؤ گے نہ؟

شیو داس۔ آپ آئیں گے۔ اور میں نہ آؤں گا!؟

کنور۔ یہاں کیسے بیٹھے ہو۔ دکان تو چل رہی ہے نا؟
شیوداس۔ آج صبح تک تو چلتی تھی۔ پر آگے کا حال نہیں معلوم؟
کنور۔ تمہارے روپے بھی بینک میں جمع تھے کیا؟
شیوداس۔ اب آؤں گا تو بتاؤں گا۔
کنور صاحب موٹر پر آ بیٹھے۔ اور شوفر سے کہا۔ ہوٹل کی طرف چلو۔
شوفر۔ حضور نے وہائٹ وے کمپنی کی دکان پر چلنے کا حکم دیا تھا۔
کنور۔ اب ادھر نہ جاؤں گا۔
شوفر۔ جیکب صاحب بالسٹر کے یہاں بھی نہ چلوں؟
کنور۔ (جھنجھلا کر) تمہیں کہیں مت چلو۔ مجھے سیدھے ہوٹل پہنچا دو۔
یاس و درد کے ان نظاروں نے جگدیش سنگھ کے دل میں سوال پیدا کر دیا تھا۔
اب میرا کیا فرض ہے"؟

(۶)

آج سے سات برس پہلے جب برہل کے راجہ صاحب نے عین عالم شباب میں گھوڑے سے گر کر وفات پائی، اور وراثت مسئلہ پیش ہوا۔ تو راجہ صاحب کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ خاندانی سلسلہ میں ان کے حقیقی چچا زاد بھائی ٹھاکر رام سنگھ کو وراثت کا حق پہنچتا تھا۔ انہوں نے دعویٰ کیا۔ مگر عدالتوں نے راجہ صاحب کی بیوی کے حق میں فیصلہ کیا۔ ٹھاکر صاحب نے اپیلیں کیں۔ پریوی کونسل تک گئے۔ مگر کامیاب نہ ہوئے۔ مقدمہ بازی میں لاکھوں روپے صرف ہو گئے۔ اپنے حصہ کی جائداد بھی ہاتھ سے نکل گئی۔ مگر مقدمہ ہارنے پر بھی وہ اطمینان سے نہیں بیٹھے۔ ہمیشہ

بیوہ رانی صاحبہ کو چھیڑتے رہتے۔ کبھی آسامیوں کو بھڑکاتے کبھی عوام کو رانی صاحبہ سے بدظن کرتے۔ کبھی فرضی مقدمات میں پھنسانے کی کوشش کرتے۔ مگر رانی صاحبہ بھی بڑے جیوٹ کی عورت تھیں۔ وہ ٹھاکر صاحب کے ہر ایک وار کا دندان شکن جواب دیتیں۔ ہاں اس کش مکش میں انہیں کثیر رقمیں خرچ کرنا پڑتیں۔ آسامیوں سے روپے وصول نہ ہوتے۔ اس لیے بار بار قرض لینے پڑتے تھے۔ مگر چونکہ قانوناً وہ ریاست کفویت پر قرض لینے کی مجاز نہ تھیں۔ اس لیے انہیں یا تو اس قانونی پیچیدگی کو چھپانا پڑتا تھا۔ یا سود کی بہت اونچی شرح قبول کرنا پڑتی تھی۔

کنور جگدیش سنگھ کا زمانہ طفولیت تو ناز و نعمت میں کٹا تھا مگر جب ٹھاکر رام سنگھ ان مقدمہ بازیوں سے بہت زیر بار ہو گئے۔ اور یہ اندیشہ بھی ہوا کہ کہیں رانی صاحبہ کی سازشوں سے کنور صاحب کی جان خطرہ نہ پڑ جائے۔ تو انہوں نے مجبور ہو کر کنور صاحب کو ڈیرہ دون بھیج دیا۔ کنور صاحب وہاں دو سال تک آرام سے رہے۔ لیکن جونہی وہ کالج کی پہلی جماعت میں داخل ہوئے ٹھاکر صاحب راہیٔ ملکِ عدم ہو گئے۔ کنور صاحب کو سلسلۂ تعلیم قطع کرنا پڑا۔ بریلی چلے آئے۔ سر پر خاندان کی پرورش اور رانی صاحبہ سے پرانی عداوت نبھانے کا بار آ پڑا اس وقت سے رانی صاحبہ کی وفات تک ان کی حالت بہت ابتر رہی۔ آمدنی کا ذریعہ یا تو قرض تھا یا مستورات کے زیور۔ اس پر خاندانی وقار کے قائم رکھنے کی فکر، یہ تین سال ان کے لیے سخت آزمائش کے دن تھے۔ ساہو کاروں سے آئے دن سابقہ رہتا تھا۔ ان کے تیرِ ستم سے جگر میں ناسور پڑ گیا تھا۔ حکام کی سخت گیریاں اور بدعتیں بھی برداشت کرنا پڑتیں۔ مگر سب سے دلخراش اپنے

عزیزوں اور یگانوں کا برتاؤ تھا جو سامنے وار نہ کر کے بغلی چوٹیں کرتے تھے۔ دوستی اور یگانگت کے پردے میں دغا کے ہاتھ چلاتے تھے۔ ان تجرباتِ تلخ نے کنور صاحب کو اختیار اور ثروت اور دولت کا جانی دشمن بنا دیا تھا۔ وہ نہایت ذکی الحس آدمی تھے۔ اور یگانوں کی بے مہریاں اور ابنائے وطن کی بے وفائیاں ان کے دل پر داغِ سیاہ بنتی جاتی تھیں۔ ادبیات کے ذوق نے انہیں انسانی فطرت کے مطالعہ کا خوگر بنا دیا تھا۔ اور یہ مطالعہ ہی انہیں روز بروز مہذّب طبقہ سے دور لیے جاتا تھا۔ وہاں ان کے دل میں جمہوریت اور غریب دوستی کے خیالات راسخ کرتا جاتا تھا۔ ان پر روشن ہو گیا تھا۔ کہ سچی انسانیت اگر زندہ ہے تو جھونپڑوں میں اور افلاس میں۔ یہیں اس مصیبت کے زمانے میں جب چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ انہیں کبھی کبھی سچی ہمدردی اور خلوص کی روشنی نظر آجاتی تھی۔ اسی طبقہ میں وفادار اور غمگسار دوست ملتے تھے۔ دولت اور ثروت ان کی نگاہ میں ظاہرداری اور تکلّف کا مترادف تھی۔ وہ اسے نعمتِ عظمیٰ کی بجائے قہرِ الٰہی سمجھتے تھے۔ جو انسان کے دل سے انسانیت اور محبت کے جذبات کو مٹا دیتی ہے۔ وہ ابرِ سیاہ ہے۔ جو دل کے روشن تاروں پر چھا جاتی ہے۔

مگر رانی صاحبہ کی وفات کے بعد جونہی دولت اور ثروت نے ان پر وار کیا۔ فلسفیانہ خیالات کی یہ سپر پاش پاش ہو گئی۔ دل پر ایک خود فراموشی کا نشہ چھا گیا۔ تحقیقِ باطن کی قوت زائل ہو گئی۔ وہ لوگ دوست ہو گئے جنہیں وہ دشمن سمجھتے تھے۔ وہ تغافل اور سرد مہری کی زد میں آگئے۔ جمہوریت کے دلائل میں حیرت انگیز ترمیم شروع ہوئی۔ ایک متمولّانہ رواداری کا احساس

رونما ہوا ہوا۔ فلسفۂ یاس نے فلسفۂ امید کو جگہ دی۔ حفظ وقار اور مناسبت حال کی زنجیر گلے میں پڑی۔ شعلہ دردانگیز نفسِ بلوریں میں روپوش ہوا، دولت اور ثروت کے مینارِ بلند نے افلاس کے جھونپڑوں کو نظر سے پوشیدہ کر دیا۔ آئینِ مراسم نے زبان پر مہر احتیاط لگا دی۔ وہ اربابِ اختیار جنہیں دیکھ کر ان کے تیور بدل جاتے تھے۔ اب ان کے مشیر ہو گئے۔ بے نوائی اور برہنگی اور قناعت جو ان کی دل سوزیوں کی منظورِ نظر تھی۔ اب اسے دیکھ کر ان کی آنکھیں جھک جاتی تھیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کنور صاحب اب بھی جمہوریت کے قائل تھے۔ مگر ان کے اظہار میں وہ پہلے کی سی آزادی نہ تھی۔ قول اب فعل سے قریب تر ہونے کے باعث باہر نکلتے ہوئے ڈرتا تھا۔ وہ پہلے کی سی طرار و تیز شمشیر برہنہ نہ تھی۔ اس میں اب زنگ لگ گیا تھا۔ قول کے عملی کو اب وہ نظرانداز نہ کر سکتے تھے۔ اور میدانِ عمل انہیں دشواریوں سے پر نظر آتا تھا۔ بیگار کے وہ جانی دشمن تھے۔ مگر بیگار کو بند کرنا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ صحت و صفائی کے زبردست مؤید تھے۔ مگر اب خرچ سے قطع نظر باشندوں ہی کی طرف سے انحراف کا گمان ہوتا تھا۔ آسامیوں کے ساتھ لگان کے لیے سختی و جبر کو وہ شرک سمجھتے تھے۔ مگر اب وہ ضروری نظر آتی تھی۔ غرض کتنے ہی اصول جو پہلے جزو ایمان بن چکے تھے اب دائرہ عمل سے خارج ہوتے جاتے تھے۔

مگر آج بینک کے احاطہ میں جو دردناک نظارے ان کی نگاہ سے گزرے ان کے خفیہ جذبات درد کے لیے بانگِ سحر کا کام کر گئے۔ بے کسی اور مجبوری کے

وہ دلفگار نالے گوشۂ جگر میں چبھ گئے۔ اس شخص کی سی حالت ہو گئی۔ جو کشتی پر بیٹھا دریا کے پر فضا ساحل کی سیر کرتا ہوا یکایک مرگھٹ کے سامنے آجائے۔ چتا پر لاشیں جلتے ہوئے دیکھے۔ سوگواروں کی آہ وزاریاں سنے۔ اور کشتی سے اتر کر سوگواروں کے ماتم میں شریک ہو جائے۔

رات کے دس بج گئے تھے۔ کنور صاحب پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے احاطہ بینک کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ وہی صدائیں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ دل میں سوال ہو رہا تھا۔ کیا اس تباہی و بربادی کا باعث میں ہوں۔ میں نے وہی کیا جس کا مجھے قانوناً اور اخلاقاً پورا مجاز تھا۔ یہ بینک کے کارکن لوگوں کی غلطی ہے کہ انہوں نے بغیر کافی ضمانت کے اتنی بڑی رقم قرض دے دی۔ معاملہ داروں کو انہیں کی گردن پکڑنی چاہیے۔ میں کوئی خدائی فوجدار نہیں ہوں۔ کہ دوسروں کی حماقتوں کا خمیازہ اٹھاؤں۔ ناحق اس ہوٹل میں ٹھہرا۔ چالیس روپے روز دینے پڑیں گے۔ کوئی چار سو روپے کے متھے جائے گی۔ اتنا سامان بھی بیکار لیا۔ کیا ضرورت تھی مخملی گدے کی کرسیوں سے یا شیشہ آلات کی سجاوٹ سے میری حقیقی شان نہیں بڑھ سکتی۔ کوئی معمولی مکان پانچ روپے روزانہ پر لے لیتا تو کیا کام نہ چلتا۔ میں اور ساتھ کے سب آدمی آسائش سے رہتے۔ یہی ہوتا نا؟ کہ لوگ بدنام کرتے۔ اس کی کیا پروا۔ جن لوگوں کے ماتھے پر ٹھاٹ کر رہا ہوں۔ وہ غریب تو روٹیوں کو بھی محتاج ہیں۔ یہ دس بارہ ہزار روپے لگا کر اگر کنویں بنوا دیتا، تو ہزاروں غریبوں کا بھلا ہو جاتا۔ اب آئندہ سے لوگوں کے چکمے میں نہ آؤں گا۔ یہ موٹر کار بالکل فضول ہے۔ میرا وقت اتنا قیمتی نہیں ہے کہ گھنٹہ آدھ گھنٹہ کی کفایت کی

خاطر دو سو روپیہ مہینہ کا خرچ بڑھالوں۔ فاقہ کش اسامیوں کے سامنے موٹر دوڑانا ان کی چھاتیوں پر مونگ دَلنا ہے۔ مانا کہ وہ رعب میں آجائیں گے۔ جدھر سے نکل جاؤں گا۔ سینکڑوں بچے اور عورتیں تماشا دیکھنے کے لیے گھروں سے نکل آئیں گے۔ پر محض اتنی سی تسکینِ نخوت کے لیے اتنا خرچ بڑھانا حماقت ہے۔ اگر دوسرے رؤسا ایسا کرتے ہیں تو کریں۔ میں ان کی ریس کیوں کروں۔ اب تک دو ہزار روپیہ میں میرا سالانہ گزر ہو جاتا تھا۔ اب دو کے بدلے چار ہزار بہت ہیں۔ اور پھر مجھے دوسروں کی کمائی کو یوں اڑانے کا مجاز ہی کیا ہے؟ میں کوئی محنت نہیں کرتا۔ کوئی تجارت کوئی کاروبار نہیں کرتا جس کا یہ نفع ہو۔ اگر میرے بزرگوں نے اپنی ہٹ دھرمی اور زبردستی سے کچھ علاقہ اپنے قبضہ میں کر لیا۔ تو مجھے ان کے مالِ غنیمت میں شریک ہونے کا کیا حق ہے؟ جو لوگ محنت کرتے ہیں۔ انہیں اپنی محنت کا پورا ثمرہ ملنا چاہیے۔ سلطنت انہیں صرف دوسروں کی دستبرد سے بچاتی ہے۔ اس خدمت کا اسے مناسب معاوضہ ملنا چاہیے۔ بس میں تو سلطنت کی طرف سے یہ معاوضہ وصول کرنے کے لیے مامور ہوں۔ اس کے سوا میرا ان غریبوں کی کمائی میں اور کوئی حق نہیں۔ یہ بیچارے مفلس ہیں، جاہل ہیں، بے زبان ہیں۔ اس لیے فی الحال ہم انہیں جتنا چاہیں ستا لیں۔ انہیں اپنے حقوق کی خبر نہیں۔ اپنی اہمیت کو نہیں سمجھتے۔ ہم انہیں جتنا چاہیں پامال کر لیں۔ پر ایک دن ضرور آئے گا۔ جب ان کے منہ میں بھی زبان ہو گی۔ اپنے حقوق سمجھیں گے۔ اور تب ولئے بر حالِ ما۔ یہ تکلفات مجھے اپنی اسامیوں سے دور کیے دیتے ہیں۔ میری شان اسی میں ہے، کہ انہیں میں رہوں۔ انہیں کی معاشرت اختیار کروں۔ اور ان کی مدد کروں۔

ہاں تو اس بینک کو کیا کروں؟ کوئی چھوٹا موٹا معاملہ ہوتا تو کہتا لاؤ۔ جہاں اور سر پر بہت سے بوجھ ہیں۔ وہاں اتنا اور سہی، پر دس لاکھ بہت ہوتے ہیں پچاس ہزار سود کے الگ ہوتے۔ اور پھر مہاجنوں کے بھی تو تین لاکھ روپے آتے ہیں ریاست کی آمدنی ڈیڑھ دو لاکھ روپیہ سالانہ سے زیادہ نہیں ہے۔ میں اتنا بڑا حوصلہ کروں بھی تو کس برتے پر؟ ہاں اگر فقیری اختیار کر لوں۔ تو البتہ شاید میری زندگی میں (بشرطیکہ ناگہانی موت نہ آجائے) یہ قضیہ پاک ہو سکے۔ اس آنچ میں کودنا اپنی ساری زندگی کو۔ اپنے حوصلوں کو، آرزوؤں کو خاکستر کرنا ہے۔ آہ! اس دن کے انتظار میں ہم نے کیا کیا مصیبتیں نہیں جھیلیں۔ والد صاحب نے اسی کوفت میں جان دی۔ یہ روز سعید ہمارے ایام تاریک کی دور افتادہ مشعل تھی۔ ہم اسی کے چرچے رہتے تھے۔ اس سے دل کو کتنی تقویت کتنا غرور تھا۔ فاقہ کشی میں ہمارے تیور نہ میلے ہوتے تھے۔ جب صبر و انتظار کے بعد ایام نیک آئے۔ تو میں اس سے بے رخی کیونکر کروں؟ زندگی کی تمناؤں پر پانی کیونکر پھیر دوں؟ اور کچھ اپنی ذاتی تمناؤں تک تو خاتمہ نہیں۔ ریاست کی ترقی اور اصلاح کی کتنی تجویزیں دل میں قائم کر چکا ہوں۔ کیا اپنی تمناؤں کے ساتھ ان تجویزوں کو بھی ڈبو دوں؟ اس کمبخت رانی نے مجھے بڑی طرح پھانسا ہے جب تک زندہ رہی کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ میری تو تباہی کا سامان کر گئی! مگر میں افلاس سے اتنا ڈرتا کیوں ہوں؟ افلاس کوئی گناہ نہیں ہے۔ اگر میری آرزوؤں کا خون۔ اگر میری زندگی کی قربانی ہزاروں خاندانوں کو تباہی اور خستہ حالی سے بچا لے۔ تو مجھے اس قربانی سے دریغ نہ ہونا چاہیے۔ آسائش سے زندگی بسر کرنا ہی تو ہماری زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ کیا یہ تسکین کا باعث نہیں ہے کہ میری خانہ ویرانی صدہا

گھروں کی آبادی کا وسیلہ ہو؟ ہماری عزت اور شہرت اور یادگار ہماری تن آسانیوں سے نہیں ہوا کرتی۔ محلوں میں رہنے والے اور دنیا کی نعمتوں کا لطف اٹھانے والے رانا پرتاپ کو کون جانتا؟ یہ اس کی تکلیفیں۔ اس کی قربانیاں، اس کی فاقہ کشیاں ہیں جنہوں نے اسے ہماری قوم کا آفتاب بنا دیا ہے۔ رام چندر نے اگر اپنی زندگی عیش وعشرت میں بسر کی ہوتی۔ تو آج ہم ان کا نام بھی نہ جانتے۔ ان کی قربانیوں ہی نے انہیں زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ ہماری عظمت ہماری دولت اور ہمارے سامانِ عیش سے بے نیاز ہے۔ میں موٹر پر سوار ہوا تو کیا۔ اور ٹٹو پر سوار ہوا تو کیا؟ ہوٹل میں ٹھہرا تو کیا؟ بہت ہوگا۔ میرے تعلقہ دار بھائی مجھ سے کنارہ کش رہیں گے میرے حوالی موالی مجھ سے الگ ہو جائیں۔ اس کی مجھے پروا نہیں ہے۔ میں تو دل سے چاہتا ہوں۔ کہ ان لوگوں سے الگ تھلگ رہوں۔ اگر محض اتنی تکلیف سے صدہا خاندانوں کا بھلا ہو جائے۔ تو میں انسان نہیں ہوں۔ اگر اسے شوق سے قبول نہ کر دوں۔ اگر اپنے گھوڑے اور فنڈ سیر و شکار، نوکر چاکر اور زمانہ ساز اعزہ و آتش خواروں سے محروم ہو کر میں ہزاروں امیر و غریب خاندانوں کا بیواؤں کا۔ یتیموں کا بھلا کر سکوں تو مجھے اس میں مطلق تامّل نہ ہونا چاہیے، ہزاروں خاندانوں کی قسمت اس وقت میری مٹھی میں ہے۔ میری تن پروری ان کا زہر قاتل اور میری نفس کشی ان کا آبِ حیات ہے۔ میں آبِ حیات بن سکتا ہوں۔ تو زہر قاتل کیوں بنوں۔ اور پھر اسے نفس کشی سمجھنا بھی میری زیادتی ہے۔ یہ بالکل اتفاقی امر ہے۔ کہ میں آج اس جائداد پر قابض ہوں۔ میں نے اسے کمایا نہیں، حاصل نہیں کیا۔ اس کے لیے خون نہیں گرایا پسینہ نہیں بہایا۔ اگر مجھے یہ جائداد نہ ملتی۔ تو آج اپنے لاکھوں بھائیوں کی طرح میں

بھی فکر معاش میں مصروف ہوتا، میں کیوں نہ بھول جاؤں کہ میں اس ریاست کا مالک ہوں۔ ایسی ہی آزمائشوں میں انسانیت کی پہچان ہوتی ہے میں نے برسوں کتب بینی کی۔ برسوں انسانی فلاح کے اصول قائل رہا۔ یقیناً یہ میری انتہا درجہ کی بزدلی، نفس پرستی ہے۔ اگر اس موقع پر میں ان تمام اصولوں کو بھلا دوں۔ خود غرضی کو انسانیت اور اخلاق پر غالب آجانے دوں۔ خود غرضی کا سبق سیکھنے کے لیے مجھے گیتا اور مل اور انسیں اور ارسطو کے شاگرد بننے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ سبق تو مجھے اپنے دوسرے بھائیوں سے مفت مل جاتا۔ عام رواج سے بہتر اور کون استاد تھا؟ عام آدمیوں کی طرح میں بھی خود غرضی اور ہوس پرستی کے آگے سر جھکا دوں۔ تو پھر خصوصیت کہاں رہی؟ نہیں میں کنونشن (رواج) کی غلامی نہ کروں گا۔ جہاں ثواب کر سکتا ہوں، عذاب نہ کروں گا۔ جہاں دُعا مل سکتی ہے۔ آہ نہ لوں گا۔ ایشور! تم میری مدد کرو، تم نے مجھے راجپوت کے گھر پیدا کیا ہے۔ میری ذات سے اس جانباز قوم کو شرمندہ مت کرو۔ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ گردن خود غرضی کے آگے نہ جھکے گی۔ میں رام اور بھیشم اور پرتاپ کا جانشین ہوں۔ تن پروری کا غلام نہ بنوں گا۔ نفس کی اطاعت نہ کروں گا۔

کنور جگدیش سنگھ کو اس وقت ایسا احساس ہوا۔ گویا وہ کسی اونچے مینار پر چڑھ گئے ہیں۔ دل میں امنگ آگئی، آنکھیں روشن ہوگئیں۔ مگر ایک ہی لمحہ کے بعد اس امنگ کا اتار ہونے لگا۔ اونچے مینار سے نیچے کی طرف آنکھیں گئیں۔ سارا جسم کانپ اٹھا۔ سر میں چکر سا آگیا۔ اس آدمی کی سی حالت ہوئی جو کسی ندی کے کنارے بیٹھا ہوا، اس میں کودنے کا ارادہ کر رہا ہو۔

انہوں نے سوچا، کیا میرے گھر کے لوگ مجھ سے متفق ہو بھی جائیں تو مجھے مجاز کہ اپنے ساتھ ان کی تمناؤں کا بھی خون کردوں؟ اور تو اور ماتا جی کبھی نہ مانیں گے اور غالباً بھائی لوگ بھی گریز کریں۔ ریاست کی حیثیت کے لحاظ سے وہ کم سے کم دس ہزار سالانہ کے مستحق ہیں۔ اور ان کے حق کو میں کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا۔ میں صرف اپنی ذات کا مختار ہوں۔ مگر میں بھی تو تنہا نہیں ہوں۔ ساوتری آپ چاہے میرے ساتھ آگ میں کودنے کو تیار ہو جائے۔ مگر اپنے پیارے لختِ جگر کو کبھی اس آنچ کے قریب نہ آنے دے گی۔

کنور صاحب نہایت خطرناک زمین پر قدم رکھ رہے تھے۔ اور ہر ایک قدم انہیں بلاتا تھا۔ کہ آگے مت بڑھو، انہوں نے اپنے چھوٹے بچے کو بڑے ناز و نعمت سے پالا تھا۔ نکبت و ادبار کے زمانہ میں بھی اس کی پرورش میں کوئی کمی نہ ہونے پائی تھی۔ کنور صاحب خود چاہے بیل گاڑیوں پر بیٹھنے کے لیے مجبور ہوں۔ مگر یہ نوبت کبھی نہیں آئی۔ کہ لڑکے کی سواری میں ٹانگن نہ رہا ہو، امارت و ریاست کا غرور اس کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھر اگیا تھا۔ ساوتری اسے ہمیشہ راجہ صاحب کہا کرتی چار سال کا نادان بچہ غرور اور تمکنت کا پتلا بن گیا تھا۔ اس کی پیشانی سے اقبال کا نور جھلکتا تھا۔ اس کے انداز میں ایک تحکم اور باتوں سے ایک خود سری کی شان ٹپکتی تھی۔ کیا باغ ریاست کی اس زینت کو بادِ حوادث کا نشانہ بننے دوں؟ کون سامنہ لے کر ساوتری سے یہ باتیں کہوں گا۔ جب سے شادی ہوئی ہے۔ اس غریب کو کبھی نہ کبھی سحر ہو گی۔ اور جب کہ سحر ہو گئی۔ سوئی ہوئی خواہشیں بیدار ہوئیں۔ خوشیوں کے چہکنا شروع کیا، تو یہ کتنا بڑا ستم ہے کہ وہ سحر شبِ غم سے بھی زیادہ تاریک ہو۔ جہاں امید

کے ستارے بھی نہیں چمکتے ۔ جہاں وہ رات کی ٹھنڈک نہیں، شبنم نہیں۔ وہ جاں بخش نیند نہیں۔ وہ پُر مزہ خواب نہیں۔ وہ کیفیت انگیز سکوت نہیں ۔ یہ ستم ہے، قہر ہے!

کنور صاحب اور زیادہ نہ سوچ سکے۔ وہ ایک سراسیمگی کی حالت میں پلنگ پر سے اٹھ بیٹھے ۔ اور کمرے میں ٹہلنے لگے۔ ذرا دیر کے بعد انہوں نے جنگلے کے باہر کی طرف جھانکا۔ اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئے ۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ ان کی پریشانیوں کی طرح بے انتہا اور عمیق سامنے گومتی ندی بہتی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ ندی کے کنارے چلے گئے۔ اور دیر تک وہاں ٹہلتے رہے۔ دل مضطر کو امواج دریا سے کوئی مناسبت ہے۔ شاید اس لیے کہ لہریں بھی مضطرب ہیں۔

انہوں نے اپنے بہکتے ہوئے خیالات کو پھر مجتمع کیا۔ اگر ریاست کی خالص آمدنی سے یہ وثیقے دیئے جائیں گے۔ تو قرض کا سود نکلنا بھی دشوار ہو جائے گا۔ اصل کا ذکر ہی کیا۔ کیا آمدنی میں اضافہ نہیں ہو سکتا؟ ابھی اصطبل میں بیس گھوڑے ہیں میرے لیے ایک کافی ہے۔ ملازموں کی تعداد سو سے کم نہ ہوگی۔ میرے لیے دو کافی سے زیادہ ہو سکتے ہیں ۔ یہ انسانیت سے بعید ہے۔ کہ اپنے ہی بھائیوں سے ذلیل خدمتیں کرائی جائیں۔ ان آدمیوں کو میں اپنی سیر کی زمین دے دوں گا۔ آرام سے کھیتی کریں گے۔ اور مجھے دعائیں دیں گے۔ باغیچوں کے پھل اب تک ڈالیوں اور تحفوں کی نذر ہو جاتے ہیں ۔ اب انہیں فروخت کر دوں گا۔ اور سب سے بڑی رقم تو بیعائی کی ہے صرف ہیش گنج کے بازار سے دس ہزار روپے وصول ہوتے ہیں ۔ یہ سب یہ قسم مہنت جی ہضم کر جاتے ہیں ۔ ان کے لیے ایک ہزار روپے سال کافی ہونے چاہئیں

اب کی اس بازار کا ٹھیکہ کر دوں گا۔ آٹھ ہزار سے کم نہ لیں گے۔ ان مدّوں سے پچیس ہزار سالانہ کی نکاسی ہو سکتی ہے۔ ساوتری اور للاّ (لڑکا) کے لیے ایک ہزار روپیہ ماہوار بہت ہے۔ میں ساوتری سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ یا تو ایک ہزار روپیہ ماہوار لو، اور مجھے چھوڑ دو۔ رانی بننے کی ہوس ہے۔ تو شوق سے بنو۔ مگر میں راجہ نہ بنوں گا۔

دفعتہً کنور صاحب کے کانوں میں آواز آئی۔ "رام نام ست ہے"۔ انہوں نے چونک کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ کئی آدمی سڑک پر ایک لاش لیے آتے تھے۔ ان لوگوں نے ندی کے کنارے چتا بنائی اور آگ لگا دی۔ دو عورتیں بین کر کے رو رہی تھیں۔ اس بین کا کنور صاحب کے دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ دل میں شرمندہ ہو رہے تھے۔ کہ میں کتنا سنگدل ہوں۔ ایک غریب آدمی کی لاش جل رہی ہے۔ عورتیں رو رہی ہیں اور میرا دل ذرا بھی نہیں پسیجتا۔ پتھر کی مورت کی طرح کھڑا دیکھ رہا ہوں۔ یکایک ایک عورت نے روتے ہوئے کہا۔ "ہائے میرے راجہ! تمہیں بس کیسے میٹھا لگا!" یہ دلخراش بین سنتے ہی کنور صاحب کے جگر میں ایک ٹھیس سی لگ گئی۔ بے اثری کا برف پھٹ گیا۔ رقت اُمڈ آئی۔ اور آنکھیں آب گوں ہو گئیں۔ غالباً اس غریب نے زہر کھا کر جان دی ہے۔ ہائے اسے زہر کیسے میٹھا لگا! اس میں کتنا درد ہے۔ کتنی حسرت، کتنی حیرت! زہر تو کڑوی چیز ہے۔ وہ کیونکر میٹھی ہو گئی۔ زہر تلخ کے بدلے جس شخص نے جانِ شیریں دے دی۔ اس پر کوئی بڑا سانحہ آیا ہو گا۔ ایسی ہی حالت میں زہر میٹھا ہو سکتا ہے۔ ان چند لفظوں میں تاثیر درد کا ایسا جادو بھرا ہوا تھا کہ کنور صاحب تڑپ گئے۔ یہی صدائیں بار بار ان کے تارِ جگر میں گونجتی تھیں۔ ان

ہیں انہیں معنی و جذبات کا ایک دفتر چھپا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اب اُن سے وہاں کھڑا رہا گیا۔ وہ آہستہ آہستہ اُن سوگواروں کے پاس آئے۔ اور ایک آدمی سے پوچھا۔ "کیا بہت دنوں سے بیمار تھے؟" اس آدمی نے کنور صاحب کی طرف ایک حسرت ناک انداز سے دیکھا، اور بولا "نہیں صاحب کہاں کی بیماری، ابھی آج شام تک مزے میں باتیں کر رہے تھے۔ معلوم نہیں شام کو کیا کھا لیا۔ کہ خون کی قے آنے لگی۔ جب تک حکیم صاحب کے یہاں جائیں۔ تب تک آنکھیں الٹ گئیں نبض چھوٹ گئی۔ حکیم صاحب آکر دیکھا، تو کہا، اب کیا ہو سکتا ہے۔ اس نے زہر کھا لیا۔ بس صاحب گھر رونا پیٹنا ہونے لگا۔ ابھی کل بائیس تیئیس سال کی عمر تھی۔ ایسا پٹھا سارے لکھنؤ میں نہیں تھا۔

کنور "کچھ معلوم نہیں ہوا۔ زہر کیوں کھایا؟"

اس آدمی نے مشتبہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ صاحب اور تو کوئی بات نہیں ہوئی جب سے یہ بڑا بینک ٹوٹا ہے۔ بہت اداس رہتے تھے۔ کئی ہزار روپے بینک میں جمع کیے تھے۔ گھی، دودھ، ملائی کی بڑی دکان تھی۔ برادری میں مان تھا۔ وہ ساری جمع ڈوب گئی۔ ہم لوگ منع کرتے تھے۔ کہ بینک میں روپیہ نہ رکھو، مگر صاحب ہو ہی تو یہ تھی۔ کہ کسی کی نہیں سنی۔ آج صبح بیوی سے گہنے مانگتے تھے۔ کہ گرد رکھ کر اہیروں کو دودھ کا دام دیں۔ اس سے باتوں باتوں میں تکرار ہو گئی۔ بس صاحب نہ جانے کہاں سے زہر لا کر کھا لیا۔

کنور صاحب کے جگر میں ایک رعشہ سا آگیا۔ معاً خیال گزرا۔ شیو داس تو نہیں ہے، پوچھا "کیا ان کا نام شیو داس تو نہیں تھا؟" اس آدمی نے حیرت سے دیکھ کر

کہا "ہاں صاحب یہی نام تھا، آپ سے جان پہچان تھی کیا؟"

کنور "ہاں ہم اور وہ بہت دنوں تک برہل میں ساتھ کھیلے تھے۔ آج شام کو وہ ہم سے بنک گھر کے احاطے میں ملے تھے۔ اگر انہوں نے مجھ سے ذرا بھی ذکر کیا ہوتا۔ تو میں حتی الامکان ان کی مدد کرتا، افسوس"

اس آدمی نے اب کنور صاحب کو غور سے دیکھا۔ اور جا کر عورتوں سے بولا "چپ ہو جاؤ، برہل کے راجہ صاحب آئے ہیں" اتنا سنتے ہی شیو داس کی ماں نے زور زور سے سر پیٹا۔ اور روتی ہوئی آکر کنور صاحب کے پیروں پر گر پڑی۔ اس کی زبان سے صرف یہ الفاظ نکلے "بیٹا بچپن میں تم اسے بھیا کہا کرتے تھے......" اور گلا پھنس گیا۔ کنور صاحب کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے۔ شیو داس کی تصویر ان کے سامنے کھڑی تھی، مگر اس کے چہرے پر دوستانہ بے تکلفی اور خلوص کی جگہ ایک شکوۂ بے کس تھا۔ جو زبان حال سے کہہ رہا تھا۔ تم نے دوست ہو کر میری جان لی"

———(۷)———

صبح ہو گئی۔ مگر کنور صاحب کی آنکھیں خواب سے آشنا نہ ہوئیں۔ جب سے وہ گومتی کے کنارے سے لوٹے تھے۔ ان کے دل پر ایک ویراگ سا چھایا ہوا تھا۔ وہ رقت انگیز نظارہ نفس کی خود غرضانہ دلیلوں کے لیے دیوارِ آہن بنا ہوا تھا۔ اس نے تزلزل کو استحکام کی صورت میں تبدیل کر دیا تھا۔ ساوتری کی دل شکنی، للّا کی مایوسانہ ضد اور ماں کی زبان جیسے ارادہ شکن اسلحہ اس دیوارِ آہن سے ٹکرا کر ناکام چلے جاتے تھے۔ ساوتری کڑھے گی کڑھے، للّا کو کشمکشِ حیات میں کودنا پڑے گا۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ اماں جان دینے پر آجائیں گی۔ بہتر ہے، میں اپنے زن و فرزند، خویش و برادر

کے لیے ہزاروں خاندانوں کا خون نہ کروں گا۔ آہ! شیوداس کو زندہ دیکھنے کے لیے میں ایسی ایسی کئی ریاستیں نثار کر سکتا ہوں۔ ساوتری کو فاقہ کرنا پڑے۔ للّا کو مزدوری کرنا پڑے۔ مجھے دربدر بھیک مانگنا پڑے۔ تب بھی دوسروں کا گلا نہ دباؤں گا۔ اب دیر کرنے کا موقع نہیں، معلوم نہیں آج کل یہ خانہ بربادیاں کون سے پہلو اختیار کریں۔ کیا کیا ستم ڈھائیں۔ مجھے اتنا پس و پیش کیوں ہو رہا ہے محض نفس کی کمزوری ہے۔ ورنہ کوئی ایسا بڑا کام نہیں جو کسی نے نہ کیا ہو۔ آئے دن لوگ لاکھوں روپے خیرات کرتے رہتے ہیں۔ ابھی ابھی بہار کے ایک راجہ نے اپنی بارہ لاکھ سالانہ نفع کی جائداد تعلیم نسواں کے لیے وقف کر دی ہے۔ میں اتنا پست ہمت کیوں ہو جاؤں؟ میں اتنا فرض سمجھتا ہوں۔ اس سے کیوں منہ موڑوں جو کچھ ہو چاہے سر پر جو کچھ پڑے۔ اس کی کیا فکر؟ گھنٹی بجائی، ایک لمحہ میں اردلی آنکھیں ملتا ہوا حاضر ہوا۔

کنور صاحب بولے، "ابھی جیکب صاحب بالسٹر کے پاس جا کر میرا سلام دو۔ جاگ گئے ہوں گے۔ کہنا نہایت ضروری کام ہے۔ نہیں یہ رقعہ لیتے جاؤ۔ موٹر تیار کرا لو۔"

——— (۸) ———

مسٹر جیکب نے کنور صاحب کو بہت سمجھایا کہ آپ اس دل دل میں قدم نہ رکھئے۔ ورنہ نکلنا محال ہو جائے گا۔ معلوم نہیں ابھی اور کتنی ایسی رقمیں ہیں جن کی آپ کو خبر نہیں ہے۔ آپ کی جانب سے اعلان ہوتے ہی سب اپنے اپنے دعوے پیش کریں گے اور آپ کو سبھی دعوے قبول کرنے پڑیں گے۔ اس وقت آپ کسی کو

مستثنیٰ کرنے کے مجاز نہ ہوں گے۔ مگر دل میں قائم ہونے والا فیصلہ چونے کا فرش ہے۔ جسے نمائش کے تھپیڑے کمزور کرنے کے بجائے اور بھی مضبوط کر دیتے ہیں کنور صاحب اپنے فیصلے پر قائم رہے اور دوسرے دن اخباروں میں اعلان کر دیا کہ ہم برہل کی رانی صاحبہ مرحومہ کی کل مالی ذمہ داریوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور معیار وعدہ کے اندر انہیں ادا کر دیں گے۔

اس اعلان کے شائع ہوتے ہی سارے لکھنؤ میں ہل چل ہو گئی۔ باخبر لوگوں کی رائے میں یہ کنور صاحب کی صریح حماقت تھی۔ اور جو لوگ قانون سے بے خبر تھے۔ انہوں نے خیال کیا۔ کہ اس میں ضرور کوئی نہ کوئی راز ہے۔ ایسے بہت کم آدمی تھے۔ جنہوں نے کنور صاحب کی نیت کی صفائی اور اخلاقی احساس کی داد دی ہو۔ مگر داد چاہے نہ ملی ہو۔ دعاؤں کی کمی نہ تھی۔ بینک کے ہزاروں غریب معاملہ دار سچے دل سے کنور صاحب کو دعائیں دے رہے تھے۔

ایک ہفتہ تک کنور صاحب کو سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملی۔ مسٹر جیکب کا خیال درست نکلا۔ مطالبات کی فہرست روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ کتنے ہی پرونوٹ ایسے ملے۔ جن کا انہیں مطلق علم نہ تھا۔ جوہریوں اور دوسرے بڑے بڑے دکانداروں کی باقی بھی کم نہ تھی۔ تخمینہ تیرہ چودہ لاکھ کا تھا۔ میزان بیس لاکھ کے قریب جا پہنچا۔ کنور صاحب گھبرائے۔ اندیشہ ہوا۔ کہ ایسا نہ ہو۔ مجھے اپنے بھائیوں کو بھی وثیقہ سے محروم کرنا پڑے۔ جس کا انہیں کوئی مجاز نہ تھا۔ یہاں تک کہ ساتویں دن انہوں نے کئی دکانداروں کو سخت سست کہہ کر سامنے سے دور کر دیا۔ جہاں شرح سود زیادہ تھی۔ اس کی تخفیف کروائی۔ اور انقضاء میعاد کی قید سے فائدہ اٹھانے میں مطلق

تامل نہ کیا ۔ انہیں مہاجنوں کی سمنت گیری پر غصہ آتا تھا۔ ان کے خیال میں مہاجنوں کو ڈوبتی ہوئی رقم کا ایک حصہ مل جانے پر بھی اپنی تقدیر کا مشکور ہونا چاہیے تھا۔ ان جزرسیوں کے باوجود کل مطالبات کی میزان انیس لاکھ سے کم نہ ہو گی۔

کنور صاحب ان کاموں سے فرصت پا کر ایک روز انڈسٹریل بینک کی طرف جا نکلے۔ بینک کھلا ہوا تھا۔ تنِ مُردہ میں جان آ گئی تھی۔ اس کا تنفس جاری ہو گیا تھا۔ بازکش معاملہ داروں کا ہجوم تھا۔ لوگ خوش خوش جا رہے تھے۔ کنور صاحب کو دیکھتے ہی صدہا آدمی فرطِ عقیدت سے ان کی طرف دوڑے۔ اور کسی نے رو کر، کسی نے ان کے قدموں کو بوسہ دے کر، کسی نے زیادہ مہذب طریق سے ان کا شکریہ ادا کیا۔ وہ بنک کے عملوں سے بھی ملے۔ لوگوں نے کہا کہ اس اعلان نے بینک کو زندہ کر دیا۔ بنگالی بابو نے سابق مینجر لالہ سائیں داس پر گل افشانی شروع کی۔ وہ سمجھتا تھا۔ دنیا میں سب آدمی بھلا مانس ہے۔ ہم کو نصیحت کرتا تھا۔ اب اس کا آنکھ کھل گیا ہے۔ اکیلا گھر میں بیٹھا رہتا ہے۔ کسی کو منہ نہیں دکھاتا۔ ہم سنتا ہے۔ وہ یہاں سے بھاگ جاتا تھا۔ پر بڑا صاحب بولا، تم بھاگے گا۔ تو ہم لوگ تمہارے اوپر وارنٹ جاری کر دے گا۔" اب سائیں داس کی جگہ بنگالی بابو مینجر ہو گئے تھے۔

اس کے بعد کنور صاحب برہل آئے۔ بھائیوں نے یہ قصہ سنا۔ تو بگڑے، اور قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دی۔ ماتاجی کو ایسا صدمہ ہوا۔ کہ وہ اسی دن بیمار ہو گئیں۔ اور ایک ہی ہفتہ میں مایوس والم زدہ اس دنیائے اسباب سے رخصت ہو گئیں۔ ساوتری کو بھی چوٹ لگی۔ پر اس نے محض صبر ہی نہیں کیا۔ بلکہ شوہر کی فیاضی اور ایثار

کی تعریف کی، رہ گئے، لال صاحب، اس نے جب دیکھا، کہ اصطبل سے گھوڑے نکلے جاتے ہیں۔ ہاتھی مکن پور کے میلے میں بکنے کے لیے بھیج دیئے گئے۔ کہار برخاست کیئے جارہے ہیں۔ تو گھبرایا ہوا کنور صاحب کے پاس آکر بولا "بابو جی! یہ سب آدمی گھوڑے ہاتھی کہاں جارہے ہیں"۔

کنور صاحب تہہ خند سے بولے۔ "یہ ایک راجہ صاحب کے نوید میں شریک ہونے جارہے ہیں"!

لال صاحب - کون سے راجہ ہیں؟

کنور - ان کا نام راجہ غریب سنگھ۔

لال صاحب - کہاں رہتے ہیں؟

کنور - بے کس گنج ہیں۔

لال صاحب - تو ہم بھی جائیں گے۔

کنور - تمہیں بھی لے چلیں گے۔ مگر اس بارات میں پیدل چلنے والوں کی عزت سواروں سے زیادہ ہوگی۔

لال صاحب - تو ہم بھی پیدل چلیں گے۔

کنور - وہاں محنتی آدمی کی تعریف ہوتی ہے۔

لال صاحب - تو ہم خوب محنت کریں گے۔

کنور صاحب کے دونوں بھائی پانچ پانچ ہزار روپیہ سالانہ وثیقہ لے کر الگ ہو گئے۔ کنور صاحب اپنے اور اپنے عیال کے لیے بمشکل تمام ایک ہزار روپیہ سالانہ کا انتظام کر سکے۔ مگر یہ رقم ایک رئیس کی شان اور وقار کے لیے کسی طرح کافی نہیں

ہے۔ حاجتمند لوگ آتے ہی رہتے ہیں۔ سادھو سنت بھی دو چار ہمیشہ پڑے رہتے ہیں۔ ان سب کی خاطر کرنی پڑتی ہے۔ بڑی مشکل سے گزر ہوتی ہے۔ ادھر ایک سال سے شیوداس کے خاندان کا بار بھی سر پر آپڑا ہے۔ مگر کنور صاحب کبھی اپنے فیصلہ پر افسوس نہیں کرتے۔ انہیں کبھی کسی نے ملول نہیں دیکھا۔ ان کا چہرہ مردانہ قناعت اور غرور صادق سے منوّر نظر آتا ہے۔ ادبیات کا شوق پہلے ہی سے تھا۔ اب باغبانی سے الفت ہو گئی ہے۔ اپنے باغ میں صبح اور شام پودوں کی دیکھ بھال کیا کرتے ہیں۔ اور لال صاحب تو پکّے کسان ہوتے نظر آتے ہیں۔ ابھی نو دس سال سے زیادہ عمر نہیں ہے۔ لیکن منہ اندھیرے کھیتوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ کھانے پینے کی بھی سدھ نہیں رہتی۔ ان کا گھوڑا موجود ہے۔ مگر ہفتوں اس پر سوار نہیں ہوتے۔ ان کی یہ دھن دیکھ کر کنور صاحب بہت خوش ہوتے ہیں۔ اور کہا کرتے ہیں۔" اب میں ریاست کے مستقبل کی طرف سے مطمئن ہوں۔ لال صاحب اس سبق کو کبھی فراموش نہ کریں گے۔ گھر میں دولت رہتی تو عیش اور شکار اور شرارت کے سوا اور کیا سوجھتی؟ دولت بیچ کر ہم نے محنت اور قناعت خریدی۔ اور یہ سودا بُرا نہیں ہے" مگر ساوتری اتنی قانع نہیں۔ وہ کنور صاحب کی ممانعت کے باوجود اسامیوں سے چھوٹے موٹے تحفے لے لیا کرتی ہے۔ اور خاندان کے رعب میں فرق نہیں آنے دیتی۔

ایمان کا فیصلہ

کان پور کے ضلع میں پنڈت بھرگودت مصر ایک بڑے زمیندار تھے۔ منشی ست نرائن لعل اِن کے مختار عام تھے۔ ساری ریاست کا سیاہ وسفید ان کے ہاتھ میں تھا۔ بڑے آقا پرست متدین آدمی تھے۔ لاکھوں روپیہ کا تحصیل وصول اور ہزاروں من غلّہ کا لین دین انجام دیتے تھے۔ اور سارا انتظام اس خوبصورتی سے کرتے۔ کہ ریاست روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ ایسے وفا کیش ملازم کی جتنی عزت ہونی چاہیے تھی، وہ ہوتی تھی۔ شادی وغم کی ہر ایک تقریب میں پنڈت جی بڑی سیر چشمی سے پیش آتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان پر اتنا اعتبار ہوگیا۔ کہ کاغذات کا سمجھنا بھی ترک کر دیا۔ خانگی مصارف کا حساب تک منشی جی کے ذمہ کر دیا گیا۔ اسی اثنا میں پنڈت جی مرگ بے ہنگام کے شکار ہوئے۔ گنگا نہانے گئے تھے۔ معلوم نہیں کسی گڑھے میں پھسل پڑے۔

یا کوئی جانور کھینچ لے گیا۔ اس کا پھر پتہ نہ چلا۔

اب منشی ست نرائن لال کے اختیارات اور بھی وسیع ہوئے۔ بجز ایک بیوہ عورت اور دو تین چھوٹے چھوٹے بچوں کے خاندان میں اور کوئی نہ تھا۔ مراسم وفات سے فرصت پانے کے بعد ایک روز بدنصیب بھان کنور نے انہیں بلایا۔ اور رو کر بولی "لالہ، سوامی جی تو ہمیں منجھدار میں چھوڑ کر چلے گئے۔ اب ڈونگا تمہیں پار لگاؤ تو لگ سکتا ہے، یہ سب کھیتی تمہاری لگائی ہوئی ہے۔ اسے تمہارے اوپر چھوڑتی ہوں۔ یہ تمہارے بچے ہیں۔ ان کا منہ دیکھو۔ جب تک تمہارے مالک جئے تمہیں اپنا بھائی سمجھتے رہے۔ مجھے بشواس ہے کہ تم اس طرح اس بوجھ کو سنبھالے رہو گے۔"

ست نرائن لال نے روتے ہوئے جواب دیا۔ "بھابی! بھیّا کیا اٹھ گئے میری تقدیر پھوٹ گئی۔ نہیں تو مجھے آدمی بنا دیتے۔ میں انہیں کا جلا یا ہوا جیا ہوں۔ اور انہیں کی چاکری میں مروں گا۔ آپ اطمینان رکھیں۔ کسی طرح اندیشہ نہ کریں۔ میں مرتے دم تک آپ کا حق نمک ادا کروں گا۔ آپ صرف اتنا کیجیئے گا۔ کہ میں جس کارندہ یا ملازم کی آپ سے شکایت کروں۔ اس کی تنبیہہ ضرور کر دیجیئے گا۔ ورنہ یہ لوگ شیر ہو جائیں گے۔

(۲)

اس حادثہ کے بعد کئی سال تک منشی ست نرائن لال نے اس ریاست کو سنبھالا۔ کبھی کسی معاملہ میں ایک کوڑی کا بل نہیں پڑا۔ سارے ضلع میں انہیں کا رسوخ تھا۔ لوگ پنڈت جی مرحوم کو بھول سے گئے۔ درباروں میں، کمیٹیوں میں انہیں کو دعوت ملتی۔ حکام ضلع ان سے اس طرح پیش آتے۔ گو یا وہ زمیندار ہیں۔ ضلع کے دیگر رؤسا ان کا ادب اور لحاظ کرتے۔ مگر روز افزوں وقار اور رسوم کے ساتھ مصارف بھی

بڑھتے جاتے تھے۔ اور بھانی کنور دوسری عورتوں کی طرح جز رس تھی۔ انسانی طبائع کی پیچیدگیوں سے واقف نہ تھی۔ پنڈت جی مرحوم ہمیشہ انہیں انعام واکرام عطا کرتے رہتے تھے اور عنایات کا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ روحانی طاقت کے بعد ایمان کا دوسرا استون فارغ البالی ہے۔ اس کے سوا وہ خود کبھی کبھی کاغذات کی جانچ کر لیا کرتے تھے۔ برائے نام ہی سہی۔ مگر اس سے نگرانی کا خوف بنا رہتا تھا۔ کیونکہ طبعی خیانت کے بعد ایمان کا سب سے بڑا دشمن موقع ہے۔ بھانی کنور یہ چٹکلے نہ جانتی تھی۔ موقع اور احتیاج جیسے مہلک دشمنوں کے نرغہ میں پڑ کر منشی کی دیانت کیوں کر جانبر ہو سکتی تھی؟

کان پور شہر سے متصل ایک بہت آباد اور زرخیز موقع تھا۔ عین گنگا کے کنارے، پنڈت جی اس گاؤں کی حسرت لیے ہوئے دنیا سے کوچ کر گئے۔ پختہ گھاٹ اور مندر اور باغ اور بنگلہ کی آرزو دل ہی دل میں رہی۔ اتفاق سے اب یہ موضع بیع ہوا۔ اس کے زمیندار ایک ٹھاکر صاحب تھے۔ کسی فوجداری کے معاملہ میں ماخوذ ہو گئے تھے مقدمہ کی پیروی کے لیے زرِ نقد کی اشد ضرورت تھی۔ منشی جی اپنے منصبی فرائض کے سلسلہ میں کچہری گئے ہوئے تھے۔ ٹھاکر صاحب نے اس کا ذکر کیا۔ منشی جی کو منہ مانگی مراد ملی۔ اسی وقت مول تول ہوا۔ بیعنامہ لکھا گیا، رجسٹری ہوئی، داخل خارج کی درخواست پیش ہو گئی۔ گو روپے موجود نہ تھے۔ مگر شہر میں ساکھ تھی۔ ایک مہاجن سے رقعہ لکھ کر بیس ہزار روپے منگوائے۔ اور ٹھاکر صاحب کے نذر کیے۔ ہاں سہولت کے خیال سے یہ سب معاملہ اپنے ہی نام سے طے کیا۔ کیونکہ نابالغوں کے نام سے بیع کرانے میں قانونی پیچیدگیاں پیدا ہوتیں۔ اور تاخیر سے شکار ہاتھ سے نکل جاتا۔

منشی جی اس دن خوش خوش بیعنامہ لیے ہوئے بھان کنور کے پاس آئے۔ پردہ کرایا۔ اور جاکر یہ مژدہ جانفزا سنایا۔ بھان کنور نے آنسوؤں سے شکریہ ادا کیا۔ پنڈت جی کے نام پر پختہ گھاٹ مندر اور بنگلہ بنوانے کی یاد تازہ ہوگئی۔ منشی ست نرائن لال دوسرے دن اس موضع میں گئے۔ اسامی حاضر ہوئے۔ نذریں گزریں۔ ایک پرتکلف دعوت دی گئی۔ حکام اور رؤسائے شہر مدعو ہوئے۔ اور کشتیوں کی خوب سیر رہی۔

(۳)

حالانکہ اس موضع کو اپنے نام سے خریدتے وقت منشی کے دل میں دغا کا ذرا بھی خیال نہ تھا۔ لیکن دو ہی چار دنوں میں اس کے انکھوے نکل آئے۔ اس موضع کے آمد و خرچ کا حساب وہ علیحدہ لکھا کرتے۔ اور اسے اپنی مالکن کو سمجھانے کی مطلق ضرورت نہ سمجھتے۔ بھان کنور یوں بھی ان معاملات میں زیادہ دخل دینا مصلحت کے خلاف سمجھتی تھی۔ اس معاملہ میں بالخصوص اسے منشی کے جذبات کا بہت زیادہ لحاظ تھا۔ کہ کہیں انہیں یہ اندیشہ نہ ہو۔ کہ میں ان سے بدگمان ہوں۔

اس طرح کئی سال گزر گئے۔ اور اب رفتہ رفتہ دونوں فریق کے دلوں میں چور بیٹھا۔ بھان کنور کو خوف ہوا۔ کہ کہیں یہ سارے کا سارا موضع ہضم کرنے کی فکر میں تو نہیں ہیں۔ ادھر قانونی طاقت منشی جی کے اخلاقی احساس پر غالب آئی۔ انہوں نے اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ موضع میرا ہے۔ زیادہ سے زیادہ بیس ہزار کا مقروض ہوں۔ کوئی بہت کرے گا۔ اپنے روپے لے لے گا۔ اس کے سوا کوئی کیا کر سکتا ہے؟ مگر یہ آگ اندر ہی اندر سُلگتی رہی۔ منشی جی پیش قدمی کے انتظار میں مسلح بیٹھے تھے۔

اور بھان کنور موقع کی منتظر تھی۔ ہاں تیر و تفنگ سے محترز رہنا چاہتی تھی۔

ایک روز اس منشی جی کو اندر بلا کر کہا۔ لالہ جی۔ یہ گداہیں مندر کا کام کب سے شروع ہوگا۔ اسے لیے ہوئے آٹھ سال ہو گئے۔ اب کام لگ جائے تو اچھا ہو۔ زندگی کا کیا اعتبار، جو کام کرنا ہے۔ اسے کر ہی ڈالنا چاہیئے"۔

حملہ کا آغاز نہایت خوش اسلوبی سے ہوا۔ منشی جی بھی دل میں اس کے قائل ہو گئے۔ مگر موقع کی زمین نہیں ملتی۔ گنگا کے کنارے کی ساری زمین آسامیوں کی جوت میں ہے۔ اور وہ اسے کسی طرح چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے"۔

بھان کنور۔ "یہ بات تو مجھے آج معلوم ہوئی۔ اٹھ سال ہوئے اس گاؤں کا آپ نے کبھی بھولے سے بھی تو ذکر نہیں کیا۔ معلوم نہیں کتنی تحصیل ہے۔ کتنا منافع، کیسا گاؤں ہے، کچھ سیر ہوتی ہے یا نہیں۔ جو کچھ کرتے ہیں، آپ ہی کرتے ہیں۔ اور کریں گے۔ لیکن کچھ مجھے بھی تو معلوم ہونا چاہیئے"۔ منشی جی سنبھل بیٹھے۔ مبارزانہ پیش قدمی شروع ہو گئی۔ بولے "آپ کو اس سے کچھ تعلق نہ تھا۔ اس لیے میں نے خواہ مخواہ آپ کو دق کرنا مناسب نہ سمجھا۔

بھان کنور کو سکتہ سا ہو گیا پردہ سے باہر ہو گئی۔ اور منشی جی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "یہ آپ کیا کہتے ہیں۔ آپ نے گاؤں میرے لیے لیا تھا یا اپنے لیے۔ روپیہ میں نے دیا یا آپ نے؟ اس پر جو خرچ پڑا، وہ میرا یا آپ کا؟ مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ اس وقت ہوش میں ہیں"۔

ست نرائن لال نے سن کر جواب دیا۔ "یہ تو آپ جانتی ہی ہیں۔ کہ موضع میرے نام سے بیع ہوا۔ روپیہ ضرور آپ کا لگا، مگر اس کا میں دین دار ہوں رہا تحصیل

وصول کا خرچ، یہ سب میں نے ہمیشہ اپنی جیب سے کیا ہے۔ اس کا حساب کتاب آمد و خرچ ہمیشہ الگ رکھتا گیا ہوں۔"

بھان کنور نے غصّہ سے بل کھا کر کہا "اس دغا کا پھل آپ کو ضرور ملے گا۔ آپ اس طرح میرے بچوں کا گلا نہیں کاٹ سکتے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ نے پیٹ میں یہ چھری چھپا رکھی ہے۔ نہیں تو یہ نوبت ہی کیوں آتی؟ خیر اب سے میرا رجسٹر اور کاغذات آپ کچھ نہ چھوئیں، میرا جو کچھ ہوگا۔ میں آپ سے لے لوں گی۔" یہ کہہ کر بھان کنور پھر پردہ کی آڑ میں آبیٹھی۔ لالہ صاحب کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ خفیف ہو کر وہاں سے اٹھ آئے۔ اور دفتر میں جا کر کچھ کاغذات الٹ پلٹ کرنے لگے مگر بھان کنور ان کے پیچھے پیچھے مردانے میں چلی آئی اور ڈانٹ کر بولی۔ میرا کوئی کاغذ مت چھونا۔ ورنہ برا ہوگا۔ تم زہر بھرے ہوئے سانپ ہو۔ میں تمہارا منہ دیکھنا نہیں چاہتی۔"

لالہ صاحب کاغذوں میں کچھ ترمیم کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ خزانہ کی کنجی نکال کر پھینک دی۔ بہی کھاتے پٹک دیئے۔ کواڑ دھڑ سے کیا بند کیا۔ اور ہوا کی طرح سن سے باہر نکل گئے۔

دوسرے مختاروں کارندوں نے یہ کیفیت سنی۔ تو پھولے نہ سمائے۔ منشی ست نرائن کے سامنے ان کی دال نہ گلنے پاتی تھی۔ اکثر لوگ یہ تیل چھڑکتے لگے۔ "نمک عجیب چیز ہے۔ پھوٹ پھوٹ کر نکلے گا۔"

طرفین سے مقدمہ بازی کی تیاریاں ہو گئیں۔ ایک طرف قانون کا قالب تھا دوسری جانب قانون کی روح ماده کو روح سے بیکار کرنے کا حوصلہ ہوا تھا۔

بھان کنور نے منشی جی چھکن لال سے پوچھا۔ ہمارا وکیل کون ہے؟"

چھکن لال نے ادھر ادھر جھانک کر کہا "وکیل تو سیٹھ جی تھے۔ مگر ست نرائن لال نے انہیں پہلے ہی گانٹھ رکھا ہے۔ اس مقدمہ کے لیے بہت ہوشیار آدمی درکار ہے۔ مہرا بابو کی آجکل خوب چل رہی ہے۔ حاکموں کے قلم پکڑ لیتے ہیں۔ بولتے ہیں تو جیسے موٹر کار چھوٹ گیا۔ حضور اور کیا کہوں۔ مجرموں کو پھانسی سے اتار لیا ہے۔ ان کے سامنے کوئی وکیل تو زبان کھول ہی نہیں سکتا۔ حضور فرمائیں۔ تو انہیں کو کر لیا جائے؟"

اس طولانی تمہید کا اثر کچھ نہ ہوا۔ بھان کنور نے کہا "پہلے سیٹھ جی سے پوچھ لیا جائے۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ آپ جائیے اور انہیں بلا لائیے۔ چھکن لال نے زیادہ حیل و حجت نہیں کی۔ سیٹھ جی کے پاس جا کر پیغام دیا۔ سیٹھ جی پنڈت بھر گو دت کے زمانہ سے یہاں کے قانونی مشیر تھے۔ مقدمہ کی کیفیت سنی تو حیرت میں آ گئے۔ ست نرائن لال کو وہ نیک نیت آدمی سمجھتے تھے۔ اسی وقت آئے۔ بھان کنور نے خود ان سے مقدمہ کی روداد بیان کی۔ اور ان پر اپنے بچوں کے بہت حقوق جتانے کے بعد اس معاملے کو فوراً ہاتھ میں لینے کی استدعا کی۔ سیٹھ جی نے باہمی مصالحت کا ذکر کیا بھان کنور پھر پردہ کے باہر نکل آئی۔ اور بولی نہیں کبھی نہیں۔ میں صلح نہ کروں گی آپ کاغذات دیکھیں۔ میرے بچوں کی خاطر تکلیف اٹھائیں۔ ست نرائن کی نیت پہلے خراب نہ تھی۔ تھوڑے دنوں سے اس کی یہ حالت ہوئی ہے۔ دیکھئے جس تاریخ کو گاؤں نیع ہوا تھا۔ اس مہینہ میں ۲۳ ہزار کا خرچ دکھایا گیا ہے۔ اس نے اپنے نام قرض لکھا ہو تو دیکھئے۔ سالانہ سود ادا ہوا یا نہیں۔ ایسے دغاباز آدمی سے میں صلح کروں گی؟"

اس میں کچھ نکتہ ہو یا نہ ہو۔ مگر جو عورت کبھی ان معاملات کے قریب نہیں گئی۔ اس کی قانونی گرفت واقعی حیرت انگیز تھی۔ یہ اس دھن کی برکت تھی۔ جو اس وقت بھان کنور کے سر پر سوار تھی۔ خلاصہ یہ کہ کاغذات کی جانچ ہوئی۔ ثبوت بہم کیے گئے۔ اور استغاثہ کی تیاریاں مکمل ہو گئیں۔

—————— (۴) ——————

منشی ست نرائن لال غصّہ میں بھرے ہوئے مکان پر پہنچے۔ لڑکے نے مٹھائی کے لیے ضد کی۔ اسے پیٹا۔ بیوی پر اس لیے برس پڑے۔ کہ اس نے کیوں لڑکے کو رلایا۔ اپنی بوڑھی ماں کو ڈانٹا۔ تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا۔ کہ لڑکے کو بہلاؤ۔ اب میں گھر پر آؤں تو بیٹھ کر لڑکے کو کھلاؤں۔ مجھے دنیا میں نہ اور کوئی کام ہے، نہ اور کوئی فکر۔ اس طرح گھر میں ایک طوفان برپا کر کے وہ باہر آئے۔ اور سوچنے لگے۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ میں بھی کیسا احمق ہوں۔ اتنے دنوں تک سارے کاغذ اپنے ہاتھ میں تھے۔ جو چاہتا تھا کر سکتا تھا۔ مگر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہا۔ آج جب سر پر آ پڑی تو سوجھی۔ میں چاہتا تو نئے ہی کھاتے بنا سکتا تھا۔ جس میں اس گاؤں کے روپے کا خرچہ کا ذکر ہی نہ ہوتا۔ افسوس! گھر میں آئی ہوئی لکشمی میری حماقت اور ناعاقبت اندیشی کی بدولت اٹھی جاتی ہے۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا۔ کہ وہ شیطان کی خالہ اس طرح مجھ سے پیش آئے گی۔ کہ کاغذات کو ہاتھ تک نہ لگانے دے گی۔

اسی ادھیڑبن میں پڑے پڑے یکایک منشی جی اچھل پڑے۔ ایک ترکیب سوجھ گئی۔ کیوں نہ کارپردازوں کو ملا لوں۔ وہ سب کے سب میری سخت گیریوں کی بدولت مجھ سے ناراض تھے۔ اس وقت سیدھے منہ مجھ سے بات نہ کریں گے۔ پر ان

میں ایسا تو کوئی نہیں ہے۔ جو زر سے بے نیاز ہو۔ ہاں اس میں صرف کیتھر کی ضرورت ہو گی۔ مگر اتنا روپیہ آئے گا کہاں سے۔ کاش ذرا پہلے جیت گیا ہوتا۔ تو یہ سب دقتیں ایک بھی نہ ہوتیں۔ بس ایک ہی ترکیب ہے۔ کسی طرح دو کاغذات غائب کر دوں۔ خطرناک معاملہ ہے۔ پر کرنا ہی پڑے گا۔

نفس کے سامنے ایک بار سر جھکانے کے بعد پھر سنبھلنا مشکل ہوتا ہے۔ گناہ کی اتھاہ ندی میں ایک بار پھسل کر ہم دم بہ دم پیچھے ہی ہوتے جاتے ہیں۔ منشی ست نرائن لال جیسا نیک آدمی اس وقت اس فکر میں تھا کہ کیونکر سیندھ لگاؤں۔ گناہ کی غذا گناہ ہے۔ منشی جی نے سوچا کیا سیندھ لگانا آسان ہے؟ اس میں کتنی ہمت، کتنی ہوشیاری، کتنی پھرتی اور صفائی کی ضرورت ہے! کون کہتا ہے کہ چوری آسان کام ہے۔ اور کہیں اگر پکڑا گیا، تو پھر بجز ڈوب مرنے کے اور کوئی علاج نہیں! منشی جی کو کسی طرح یقین نہیں آتا تھا۔ کہ وہ اس کام کو انجام دے سکتے ہیں ہاں ایک ترکیب اس سے آسان نظر آئی۔ کیوں نہ دفتر میں آگ لگا دوں۔ ایک بوتل مٹی کے تیل اور ایک دیا سلائی کی ضرورت ہے۔ کسی بدمعاش کو ملا لوں۔ اس کی مدد سے سارا کام ہو سکتا ہے۔ مگر یہ کیا معلوم کہ وہ بھی اس کمرہ میں رکھی ہے یا نہیں۔ اس چڑیل نے ضرور اسے اپنے پاس رکھا ہو گا۔

منشی جی اسی ادھیڑ بن میں کروٹیں بدلتے رہے۔ نئے نئے منصوبے سوچتے مگر پھر اپنی ہی دلیلوں سے انہیں مٹا دیتے۔ جیسے برسات میں آسمان پر بادلوں کی نئی نئی صورتیں بنتی اور پھر ہوا کے زور سے بگڑ جاتی ہیں۔

لیکن یہ خیال دل سے کسی طرح دور نہ ہوتا تھا۔ کہ ان کاغذات کو اپنے ہاتھ

میں لانا چاہیے ۔ یہ کام کٹھن ہے ۔ مانا، پر ہمت نہ تھی ۔ تو رار کیوں مول لی تھی؟ کیا کسی کی ۲۰ ہزار کی جائداد آسانی سے ہاتھ آ جائے گی؟ خواہ کسی صورت سے ہو ۔ چور بنے بغیر کام نہیں چل سکتا ۔ آخر جو لوگ یہ کام کرتے ہیں ۔ وہ بھی تو آدمی ہی ہوتے ہیں ۔ بس ایک چھلانگ کا کام ہے ۔ اگر پار ہو گئے ۔ تو راج کریں گے ۔ اگر گر پڑے تو جان سے ہاتھ دھوئیں گے ۔

اس طرح منشی ست نرائن نے اپنا دل مضبوط کیا ۔

(۵)

رات کے دس بج گئے تھے ۔ منشی ست نرائن لال کنجیوں کا ایک گچھا کمر میں دبائے گھر سے باہر نکلے ۔ دروازے پر تھوڑے سے پیال رکھے ہوئے تھے ۔ اسے دیکھتے ہی وہ چونک پڑے ۔ مارے خوف کے کلیجہ دھک دھک کرنے لگا ۔ معلوم ہوا کہ کوئی آدمی چھپا بیٹھا ہے ۔ ان کے قدم رک گئے ۔ پیال کی طرف غور سے دیکھا اس میں مطلق حرکت نہ ہوئی ۔ تب ہمت بندھ گئی ۔ آگے بڑھے اور دل کو سمجھانے لگے میں کیسا احمق ہوں ۔ اپنے دروازہ پر کس کا خوف ۔ راستہ ہی میں مجھے کس کا خوف ہے ۔ میں اپنی راہ جاتا ہوں ۔ کوئی میری طرف ترچھی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا ہاں جب مجھے کوئی عین موقع پر پکڑ لے تو البتہ ۔ دفعتہً انہوں نے بھان کنور کے ایک چپراسی کو آتے دیکھا ۔ کلیجہ سن سے ہو گیا ۔ وہ لپک کر ایک اندھیری گلی میں گھس گئے ۔ اور وہاں بڑی دیر تک کھڑے رہے ۔ جب وہ سپاہی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو پھر سڑک پر آئے ۔ سپاہی آج صبح تک ان کے حکم کا غلام تھا اسے انہوں نے بارہا گالیاں دی تھیں ۔ لاتیں بھی ماری تھیں ۔ مگر آج اس کی صورت دیکھ کر ان کی روح فنا

ہو گئی۔

انہوں نے پھر دلیل کی پناہ لی: میں جیسے بھنگ کھا گیا ہوں۔ اس چپڑاسی سے اتنا ڈرا۔ بالفرض وہ مجھے دیکھ ہی لیتا تو میرا کیا کر سکتا تھا؟ ہزاروں آدمی راستہ پر چل رہے ہیں۔ انہیں میں ایک میں بھی ہوں۔ کیا وہ سب کے دلوں کا حال دیکھنے نکلا ہے؟ غالباً مجھے دیکھ کر وہ ادب سے سلام کرتا۔ اور کچھ دور تک میرے ساتھ چلتا۔ عجب نہیں کہ آج وہاں کی داستان بیان کرتا۔ اس طرح دل کو مضبوط کر کے وہ پھر آگے بڑھے۔ یہ شاید سچ ہے کہ گناہ کے قابو میں آیا ہوا دل خزاں کا مارا ہوا پتا ہے۔ جو ہوا کے جھونکے میں گر پڑتا ہے۔ بازار میں پہنچے، زیادہ تر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ان میں گانڈ اور گائیں بیٹھے ہوئے رمز و کنائے کر رہے تھے۔ صرف حلوائیوں کی دکانیں کھلی تھیں۔ اور کہیں کہیں ایک آدھ گجرے والے ہار کی ہانک لگاتے پھرتے تھے۔ یہ حلوائی منشی جی کو پہچانتے تھے۔ مگر منشی جی نے سر نیچا کر لیا۔ کچھ رفتار تبدیل کی۔ اور لپکتے ہوئے چلے، دفعتہً ایک بگھی آتی ہوئی دکھائی دی انہوں نے اسے پہچان لیا۔ یہ بلبھ داس سیٹھ وکیل کی بگھی تھی۔ اس میں بیٹھ کر وہ ہزاروں بار سیٹھ جی کے ساتھ کچہری گئے تھے۔ پر آج یہ انہیں کالے دیو کی طرح خوفناک معلوم ہوئی۔ انہوں نے رخ پھیر لیا۔ اور بھاگ کر ایک خالی دکان پر چڑھ گئے۔ سانڈ نے سمجھا کوئی نیا رقیب پیدا ہوا ہے۔ سینگ جھکائے پھنکارتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ پر اس اثنا میں بگھی نکل گئی۔ اور منشی کی جان میں جان آئی اب کے انہوں نے دلیلوں سے دل کو نہ سمجھایا۔ سمجھ گئے کہ اس وقت اس سے کوئی سود نہیں۔ خیریت ہو گئی کہ وکیل نے دیکھا نہیں۔ ورنہ ایک ہی گھاگ ہے۔ میرے

بستر سے تاڑ جاتا۔ ایک فرلانگ چل کر ایک گلی ملی۔ یہی بھان کنور کے مکان کا راستہ تھا۔ ایک دھندلی سی لالٹین روشن تھی۔ جیسا منشی جی نے قیاس کیا تھا۔ پہرہ دار کا پتہ نہ تھا۔ اصطبل میں چماروں کے یہاں ناچ ہو رہا تھا۔ کئی چمار نین بنا و سنگار کر کے ناچ رہی تھیں۔ چمار مردنگ بجا بجا کر گاتے تھے۔

گھر پے نہیں مائیں شیام گھیر آئے بدرا

اور دونوں پہرہ دار وہاں تماشا دیکھ رہے تھے۔ منشی جی کے کلیجہ میں دھڑکن تھی۔ سر دھم کرتا تھا۔ ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ سانس پھول رہی تھی۔ بدن بدن کا ایک ایک روٗیاں آنکھ اور کان بنا ہوا تھا۔ ان کی ساری طاقت اور چُستی اور اوسان اور حواس اور احتیاط اس وقت ارادہ کی مدد پر مستعد تھیں۔

منشی جی بلّی کی طرح دبے پاؤں لالٹین کے پاس گئے۔ اور جس طرح وہ چوہے پر جھپٹتی ہے۔ اسی طرح انہوں نے جھپٹ کر اس کا پٹ کھولا۔ اور اسے گل کر دیا ایک مرحلہ طے ہو گیا۔ مگر جتنا سمجھتے تھے اتنا مُشکل نہ تھا۔ دل کچھ مضبوط ہوا۔ دفتر کے برآمدے میں پہنچے۔ اور ایک لمحہ تک خوب کان لگا کر آہٹ لی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ صرف چماروں کے گانے کی آواز کان میں آتی تھی۔ دروازہ پر وہی پرانا قفل تھا۔ اس کی کنجی آج بہت تلاش کر کے بازار سے خرید لائے تھے۔ قفل کھل گیا۔ کواڑوں نے بہت ہی دبی زبان سے صدائے احتجاج بلند کی۔ منشی جی دفتر میں داخل ہوئے۔ ان کے اعضا میں اس وقت بندر کی سی پھرتی اور چُستی تھی۔ اندر چراغ جل رہا تھا۔ منشی جی کو دیکھ کر اس نے ایک بار سر ہلایا۔ گویا انہیں اندر آنے کی ممانعت کی۔

منشی جی کے پیر تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ایڑیاں زمین سے اُچھلی پڑتی تھیں۔ سانس سینہ کو چھوڑ کر نکلنا چاہتا تھا۔ گناہ کا اتنا سنگین بار انکی برداشت سے باہر تھا۔

پل بھر منشی جی نے بہیوں کو الٹا پلٹا۔ ان کی تحریر آنکھوں میں تیرتی نہ تھی۔ انتخاب کی مہلت نہ تھی۔ انہوں نے کاغذات کا ایک پشتارہ باندھا۔ اور بغل میں دبا کر تیر کی طرح کمرے سے باہر نکل آئے۔ دروازہ کو آہستہ سے بند کیا۔ اور اس پاپ کی گٹھری کو لیے ہوئے اندھیری گلی میں غائب ہو گئے۔

تنگ اندھیری متعفن گلیوں میں وہ برہنہ پا تیزی سے قدم بڑھائے ہوئے اس طمع خود غرضی بے وفائی اور دغا کا بار گراں لیے ہوئے چلے جاتے تھے۔ گویا گناہوں سے لدی ہوئی روح دوزخ کی نالیوں میں بہی جاتی تھی۔

بہت دیر تک بھٹکنے کے بعد وہ گنگا کے کنارے پہنچے۔ جس طرح تاریک دلوں میں کہیں کہیں ایمان کی دھندلی روشنی چھپی رہتی ہے۔ اسی طرح ندی کی سیاہ اور ساکت سطح پر تارے جھلملا رہے تھے۔ کنارے پر چند سادھو دھونی رمائے ہوئے تھے۔ شعلۂ حقیقت دل کی بجائے باہر دہک رہا تھا۔ منشی جی نے اپنا پشتارا اتارا۔ اور چادر میں لپیٹ کر اسے ندی میں پھینک دیا۔ سوئی ہوئی لہروں میں کچھ ہلچل ہوئی۔ اور سناٹا ہو گیا۔

—— (۶) ——

منشی ست نرائن لال کے گھر میں ان کی ماں اور بیوی دو عورتیں تھیں۔ تاہم منشی جی کو گنگا میں ڈوب مرنے یا کہیں بھاگ جانے کی ضرورت نہ تھی۔ دونوں

عورتیں تعلیم سے بے بہرہ تھیں۔ نہ وہ باڈیز پہنتی تھیں۔ نہ موزے، نہ ہارمونیم پر گا سکتی تھیں۔ یہاں تک کہ انہیں صابن کے استعمال تک کا علم نہ تھا۔ وہ بالوں میں ہیئر پن (Hair Pin) لگانا تک نہ لگانا جانتی تھیں۔ بہو میں اپنی عزت کا ذرا بھی احساس نہ تھا۔ نہ ساس میں خودداری کی اسپرٹ، بہو اب تک ساس کی گھرکیاں بھیگی بلّی کی طرح سہہ لیتی تھی۔ ساس کو بچوں کے نہلانے دھلانے حتیٰ کہ گھر میں جھاڑو دینے تک سے عار نہ تھا۔ بہو عورت کیا مٹی کا لوندا تھی۔ ایک پیسہ کی بھی ضرورت ہو تو ساس سے مانگتی۔ بغرض دونوں عورتیں اپنے حقوق سے بے خبر جہالت کی تاریکی میں پڑی ہوئی جانوروں کی طرح زندگی کے دن کاٹتی تھیں۔ ایسی پھوہڑ تھیں۔ کہ دل موٹ، سموسے وغیرہ بھی گھر ہی میں بنا لیتی تھیں۔ اپنے ہی ہاتھوں سے کتنی ہی جسمانی شکایتوں کا علاج بھی کر لیتی تھیں۔ بیٹھی گھاس پات کوٹا کرتی تھیں۔ منشی جی نے ماں کے پاس جا کر کہا۔ "اماں! کچھ روپیہ نکالو۔ مجھ سے بھاں سے ان بن ہو گئی۔ کل انہوں نے مجھے بے قصور الگ کر دیا۔ ماں نے چونک کر پوچھا۔" الگ کر دیا! کیا بات ہوئی؟ بھاں کنور کا مزاج تو ایسا نہ تھا!"

منشی۔ بات کچھ نہیں تھی۔ میں نے اپنے نام سے جو موضع لیا تھا۔ اُسے مَیں نے اپنے قبضہ میں کر لیا۔ کل مجھ سے اُن سے صاف صاف باتیں ہوئیں مَیں نے کہہ دیا کہ گاؤں میرا ہے۔ مَیں نے اپنے نام سے لیا ہے۔ اس سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں بس جامہ سے باہر ہو گئیں۔ جو جی میں آیا بکتی رہیں۔ اسی وقت مجھے نکال دیا، اور کہا میں تم سے لڑ کر اپنا گاؤں لے لوں گی۔ اب آج ان کی طرف سے میرے اوپر مقدمہ دائر ہو گا۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ میرا اس پر قبضہ ہے۔ ایک نہیں ہزار

مقدمے چلائیں، ڈگری میری ہو گی۔

ماں نے بہو کی طرف دیکھا۔ بہو نے ماں کی طرف تاکا۔ ماں بولیں "کیوں بھیا؟ وہ گاؤں تو تم نے انہیں کے روپے سے انہیں کے لیے لیا تھا؟"

منشی۔ لیا تھا تب لیا تھا۔ اب مجھ سے ایسا آباد زرخیز گاؤں نہیں چھوڑا جاتا وہ میرا کچھ نہیں کر سکتیں۔ اپنے روپیہ کی وصول یابی کا بھی دعوی نہیں کر سکیں۔ ڈیڑھ سو گاؤں تو ہیں۔ تب بھی ہوس نہیں مانتی۔

ماں۔ بیٹا کسی کے دھن ہوتا ہے۔ تو دل اسے پھینک تھوڑا ہی دیتا ہے۔ تم نے اپنی نیت خام کی۔ یہ اچھا نہیں کیا۔ دنیا تم کو کیا کہے گی؟ اور دنیا چاہے، کچھ کہے یا نہ کہے۔ بھلا تم کو ایسا چاہیے۔ کہ جس کی گود میں اتنے دن پلے۔ جس کا اتنے دنوں تک نمک کھایا۔ اب اسی سے دغا کرو۔ نارائن نے تمہیں کیا نہیں دیا ہے؟ مزے سے کھاتے ہو، پہنتے ہو۔ گھر میں نارائن کا دیا چار پیسے ہیں، بال بچے ہیں۔ اور کسی کو کیا چاہیئے؟ میرا کہنا مانو، یہ کلنک کا ٹیکا اپنے ماتھے نہ لگاؤ۔ یہ اجس مت لو۔ برکت اپنے ہی پسینہ کی کمائی ہوتی ہے۔ حرام کی کوڑی کبھی نہیں پھلتی۔

منشی۔ یہ سب باتیں پوتھی کے بینگن ہیں۔ دنیا ان پر چلنے لگے۔ تو سارا نقشہ بگڑ جائے۔ میں نے اتنے دنوں ان کی خدمت کی۔ ایسے ایسے چار پانچ گاؤں میری ہی بدولت بڑھ گئے۔ جب تک پنڈت جی زندہ تھے۔ میری نیت کی قدر کی۔ آنکھ میں دھول ڈالنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ خود ہی میری خاطر کر دیا کرتے انہیں مرے ہوئے آٹھ سال ہو گئے۔ مگر مسماۃ کے ایک بیڑے پان کی بھی قسم کھاتا ہوں۔ میری ذات سے ان کی ہزاروں روپے ماہوار کی بچت ہوتی تھی۔ کیا ان

کو اتنی سمجھ نہیں تھی. کہ یہ شخص جو اتنی ایمانداری سے میرا کام کرتا ہے۔ اس نفع میں کچھ اس کا بھی حق ہے یا نہیں۔ حق کہہ کر نہ دو۔ انعام کہہ کر دو کسی طرح دو تو مگر وہ سمجھی تھیں۔ کہ میں نے اسے دس روپے مہینہ پر مول لے لیا ہے۔ میں نے آٹھ سال تک صبر کیا۔ اب کیا دس روپے میں زندگی بھر غلامی کیا کروں۔ اور اپنے بچوں کو دوسروں کا منہ تاکنے کے لیے چھوڑ جاؤں؟ مجھے یہ موقع ملا ہے۔ اسے کیوں چھوڑوں؟ زمینداری کی ہوس لیے کیوں مروں؟ جب تک زندہ رہوں گا۔ خود کھاؤں گا۔ میرے بعد میرے بچے چین اڑائیں گے "۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بولیں "بیٹا! میں نے تمہارے منہ سے ایسی باتیں کبھی نہ سنی تھیں۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تمہارے آگے بال بچے ہیں۔ آگ میں ہاتھ نہ ڈالو"۔ بیوی نے ساس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ایسا دھن نہ چاہیئے۔ ہم ابھی روٹی دال میں خوش ہیں"۔

منشی۔ اچھی بات ہے۔ تم لوگ روٹی کھانا، گزی گاڑھا پہننا مجھے اب حلوے پوری کی خواہش ہے۔

ماں۔ یہ ادھرم مجھ سے نہ دیکھا جائے گا۔ میں گنگا میں ڈوب مروں گی۔

بیوی۔ تمہیں یہ کانٹے بونا ہے۔ تو مجھے میکے میں پہنچا دو۔ میں اپنے بچوں کو لے کر اس گھر میں نہ رہوں گی۔

منشی نے جھنجھلا کر کہا۔ "تم لوگوں کی عقل تو بھنگ کھا گئی ہے۔ یہ سب سرکاری ملازم رات دن دوسروں کا گلا دبا دبا کر رشوتیں لیتے ہیں۔ اور چین کرتے ہیں۔ نہ ان کے بال بچوں ہی کو کچھ ہوتا ہے نہ ان کو۔ ادھرم ان کو کیوں نہیں کھا جاتا۔ جو مجھ ہی کو کھا جائے گا۔ میں نے تو ایمانداروں کو ہمیشہ تکلیف ہی میں دیکھا۔ میں

نے تو جو کیا ہے۔ اس کا سکھ اٹھاؤں گا۔ تم لوگوں کے جی میں جو آئے کرو۔

(۷)

صبح کے وقت بھان کنور کا دفتر کھلا تو کاغذات سب غائب تھے۔ منشی چھکن لال بدحواس گھر میں گئے۔ اور مالکہ سے پوچھا، کاغذات کیا آپ نے اٹھوا لئے ہیں؟ بھان کنور نے کہا: "مجھے کیا خبر۔ جہاں آپ نے رکھے ہوں گے، وہیں ہوں گے۔ دم کے دم میں سارے گھر میں طوفان مچ گیا، پہرہ داروں پر مار پڑنے لگی۔ بھان کنور کو معاً ست نرائن لال پر شبہ ہوا۔ مگر ان کے خیال میں چھکن لال کی مدد کے بغیر یہ کام ہونا غیر ممکن تھا۔ پولیس میں رپٹ ہوئی۔ ایک اوجھا نام نکالنے کے لیے بلایا گیا۔ مولوی صاحب نے قرعہ پھینکا۔ اوجھا نے بتلایا کسی پرانے دشمن کا یہ کام ہے مولوی صاحب نے بتلایا کسی گھر کے بھیدی نے یہ حرکت کی ہے۔ شام تک یہی دوڑ دھوپ رہی۔ اور تب یہ صلاح ہونے لگی۔ کہ ان کاغذات کے بغیر مقدمہ کیونکر چلے گا۔ روداد پہلے ہی کمزور تھی۔ جو کچھ سہارا تھا، انہیں اندراجات کا تھا۔ جو خود منشی ست نرائن لال نے کیے تھے۔ اب تو وہ ثبوت بھی ہاتھ سے گئے۔ دعویٰ میں کچھ جان ہی نہیں باقی رہی۔ مگر بھان کنور نے مقدمہ دائر کرنے پر زور دیا۔ بلا سے ہار جائیں گے۔ ہماری چیز کوئی دوسرا چھین لے تو ہمارا دھرم ہے۔ کہ اس چیز کو واپس لینے کے لیے اپنے قابو بھر لڑیں۔ ہار مان کر بیٹھ رہنا بزدلوں کا کام ہے۔ سیٹھ جی وکیل کو اس سانحہ کی اطلاع دی گئی۔ انہوں نے بھی یہی کہا کہ مقدمہ بالکل بے جان ہو گیا۔ صرف عقلی اور قیاسی دلیلوں پر دارومدار ہے۔ عدالت نے تسلیم کیا تو کیا، ورنہ ہارنا پڑے گا۔ یہ بھان کنور کو ضد تھی۔ کہ مقدمہ

ضرور دائر ہو۔ لکھنؤ اور الہ آباد سے دو بلند بانگ بیرسٹر بلائے گئے۔ اور ایک ہفتہ کے اندر استغاثہ دائر ہو گیا۔

سارے شہر میں اس مقدمہ کی دھوم تھی۔ کتنے ہی رؤسا کو بھان کنور نے شہادت میں طلب کیا تھا۔ دل چسپی کا خاص سبب یہ تھا۔ کہ بھان کنور خود بھی پردہ کی آڑ میں بیٹھی ہوئی روداد سنتی تھی۔ کیونکہ اسے اب اپنے مختاروں اور ملازموں پر بھروسہ نہ تھا۔

استغاثہ کے بیرسٹر نے ایک مدلل اور موثر تقریر کی۔ اس نے منشی ست نرائن لال کی سابقہ دیانت اور خلوص نیت اور ان پر پنڈت بھرگو دت کے کامل اعتماد کا ذکر کیا۔ بعدازاں یہ دکھایا کہ مدعا علیہ کی مالی حالت ہرگز ایسی نہ تھی۔ جسے اتنے صرفِ کثیر کی متحمل ہو سکتی۔ آخر میں اس نے منشی جی کی دغا اور بدعہدی پر ایسے رقت آمیز پیرایہ میں بحث کی کہ سامعین کی آنکھیں پر آب ہو گئیں "کتنے افسوس اور عبرت کا مقام ہے۔ کہ ایسا وفادار آقا پرست آدمی رفتہ رفتہ اتنا گر جائے۔ کہ اس کی بے کس بیوہ اور یتیم بچوں کی گردن پر چھری پھیرنے سے باز نہ آئے۔ جن کا نمک ان کی ہڈیوں میں پیوست ہو گیا ہے۔ انسانی خباثت اور کجروی کی اس سے زیادہ عبرت ناک مثال نہیں مل سکتی۔ نتائج کے اعتبار سے دیکھئے تو اس شخص کی سابقہ دیانت اور وفا کی وقعت بالکل نہیں باقی رہتی۔ کیونکہ وہ جواہر نہ تھے۔ بلکہ سنگریزے تھے۔ جو محض اپنا اعتماد قائم کرنے کے لیے۔ پیش کیے گئے تھے۔ وہ محض ایک رنگین جال تھا۔ جو ایک خوش اعتقاد اور کم اندیش رئیس کو پھنسانے کے لیے پھیلایا گیا تھا۔ خیال کیجیے کہ اس شخص کا باطن کتنا تاریک کتنا گہرا اور اس

کی خیانت کتنی دور رس ہے! اپنے حریف کے ساتھ دغا کرنا کسی حد تک معافی کے قابل ہے۔ مگر اس شخص نے ان بے کسوں کے ساتھ دغا کی ہے۔ جن کے ساتھ بہبودی کرنا انسانی سرشت کا خاصہ ہے۔ کاش ہمارے ہاتھ میں اندراجات ہوتے۔ جو بیعانہ لکھانے کے وقت منشی صاحب ممدوح نے فرمائے تھے۔ تو عدالت پر ان کی سیر باطنی روشن ہو جاتی مگر ان کا دفتر سے عین برخاستگی کے روز غائب ہو جانا بھی عدالت کے لیے کچھ کم یقین انگیز نہ ہونا چاہیے۔ ایسی رذالت کے بعد اس شخص کے نزدیک کوئی کام ناکردنی نہیں ہو سکتا۔

کئی روز تک شہر کی شہادتیں ہوئیں۔ مگر بیشتر سماعی تھیں۔ دو ایک صاحبوں نے چشم دید شہادت کا دعویٰ کیا۔ پر جرح میں اکھڑے ہوئے۔

آج کی کارروائی ختم ہو گئی۔ دوسرے دن پھر مقدمہ پیش ہوا۔

مخالف فریق کے وکیل صاحب نے جوابی تقریر کرنا شروع کی جس میں تضحیک کا پہلو غالب تھا۔ "یہ نرالی منطق ہے۔ کہ ایک دولت مند کا ملازم جو کچھ خریدے وہ اس کے آقا کی چیز ہے۔ اس دلیل کے مطابق ہماری گورنمنٹ کو اپنے ملازمین کی جائداد پر قبضہ کر لینا چاہیئے۔ یہ تسلیم کرنے میں ہم کو عذر نہیں کہ ایسی کثیر رقم ہماری دسترس سے باہر تھی۔ اور یہ رقم ہم نے اپنے آقا ہی سے قرض لی۔ مگر بجائے اس کے کہ ہم سے قرضہ کی وصولی کا تقاضا کیا جاتا۔ ہم سے وہ جائداد مانگی جاتی ہے۔ حساب کے کاغذات پیش کیے جائیں۔ تو وہ صاف بتلا دیں گے۔ کہ اب میرے ذمے بھان کنور کا ایک حبہ بھی باقی نہیں ہے۔ اگر میں آپ سے قرض لے کر اپنی شادی کر لوں تو کیا کل آپ مجھ سے میری بیوی کو چھین لینے کا دعویٰ کریں گے؟ ہمارے روشن

خیال دوست نے ہمارے اوپر بےکسوں اور یتیموں کے ساتھ دغا کرنے کا الزام لگایا ہے۔ اگر منشی ست نرائن لال کی نیت فاسد ہوتی۔ تو اس کا بہترین موقع وہ تھا۔ جب اس کے آقائے نامدار کی وفات ہوئی تھی۔ اس طولانی انتظار کی کیا ضرورت تھی؟ اگر آپ شیر کو پھنسا کر اس کے بچے کو اسی وقت نہیں پکڑ لیتے بلکہ اسے بڑھنے اور خونخوار ہونے کا موقع دیتے ہیں۔ تو مجھے آپ کے دماغ کے صحیح ہونے پر شبہ ہوگا۔ مگر شاید منشی ست نرائن لال کے رنگین جال میں کوئی ایسی کرامات ہو۔ جسے سمجھنے میں ہمارے عالم دوست قاصر ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ منشی جی نے حقِ نمک ادا کر دیا۔ آٹھ سال تک کمال دیانت سے کام انجام دیا۔ اور آج انہیں اپنی نیک نیتی کا ثمرہ جو مل رہا ہے۔ وہ نہایت درجہ دلدوز اور جگر خراش ہے۔ اس میں بھان کنور کی کوئی خطا نہیں۔ وہ ایک نیک خاتون ہیں۔ مگر اپنی صنف کی اعتقادی کمزوریوں سے خالی نہیں۔ دیانتدار آدمی خاصۃً صاف گو اور کم سخن ہوتا ہے۔ اسے باتوں میں نمک مرچ ملانے اور قند و شکر گھولنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہی باعث ہے کہ پنڈت جی کی بیوہ پر شیریں بیان رقیبوں کو وار کرنے کا یہ موقع مل گیا۔ اس دعویٰ کی بنیاد صرف اتنی ہے، اور کچھ نہیں۔ بھان کنور یہاں موجود ہیں۔ کیا وہ کہہ سکتی ہیں۔ کہ اس آٹھ سال کے عرصہ میں کبھی اس موضع کا ذکر انہوں نے کیا۔ کبھی اس کے نفع نقصان، آمد و خرچ یا لین دین کا چرچا ان سے کیا گیا۔ میں گورنمنٹ کا ملازم ہوں۔ اگر میں آج دفتر میں آکر اپنے خانگی انتظامات کی داستانیں چھیڑ دوں۔ اپنے اخراجات کی زیادتی اور اپنے خدمت گار کی نیکیوں کا قصہ گانے لگوں۔ تو شاید مجھے بہت جلد اپنے عہدے سے سبکدوش ہونا پڑے۔

اور ممکن ہے کچھ دنوں بنارس کے شاندار مہمان خانہ میں رکھا جاؤں۔"

اس کے بعد متعدد شہادتیں پیش ہوئیں: بالخصوص قرب وجوار کے مواضعات کے لوگوں کی جنہوں نے بیان کیا کہ انہوں نے منشی ست نرائن لال کو اپنے دستخط سے رسیدیں دیتے اور اپنے ہی نام سے خزانہ میں روپیہ داخل کرتے دیکھا ہے۔ اس موضع کا دفتر اسی جگہ تھا۔ اس میں منشی جی کی سیر بھی ہوتی ہے۔ وغیرہ۔

اس کارروائی کے بعد شام ہوگئی۔ منصفِ عدالت نے کل فیصلہ سنانے کا وعدہ کیا۔

منشی ست نرائن کی فتح اب یقینی تھی۔ استغاثہ کی شہادتیں کمزور تھیں۔ بحث قیاسی دلیلوں پر مبنی۔ ان کے منصوبے اب پورے ہونے والے تھے۔ ان کا شمار بھی زمینداروں میں ہوگا۔ اور اپنی سعی و محنت سے بہت جلد وہ بھی رؤسا کے زمرہ میں شامل ہوسکیں گے۔ لیکن کسی نہ کسی وجہ سے وہ اب شہر کے شرفا سے آنکھیں ملاتے شرماتے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی ان کا سر نیچا ہوجاتا تھا۔ اور وہ بازار میں نکلتے تو انہیں دیکھ کر اکثر دکانداروں میں سرگوشیاں ہونے لگتیں۔ اور لوگ ان کی طرف بری نگاہوں سے دیکھتے اس لئے وہ بازار سے سر جھکائے قدم بڑھائے بھاگ نکلتے تھے ابتک لوگ انہیں ایک سچا بے لوث اور پاک طینت آدمی سمجھتے تھے شہر کے وضعدار اور شریف لوگ انہیں اعزاز کی نگاہوں سے دیکھتے اور بڑی خاطر سے پیش آتے حالانکہ ابھی منشی جی کو آزمائش کا موقع نہیں ملا تھا۔ پر ان کا دل کہتا تھا کہ میری وہ بات نہیں رہی۔ اصل حقیقت سارے زمانہ پر روشن ہے۔ اور عدالت میرے حق میں فیصلہ ہی کیوں نہ کر دے۔ لیکن میری ساکھ اب جاتی رہی ذلوں سے میری عزت اُٹھ گئی۔ اب مجھے بھی لوگ خود غرض ریاکار مطلبی سمجھیں گے۔

غیروں کی تو بات الگ رہی۔ خود ان کے گھر والے ان کے شریک نہیں تھے۔ بوڑھی ماں نے تین دن سے منہ میں پانی نہیں ڈالا۔ اور بیوی بار بار ہاتھ جوڑ کر کہتی۔ کہ "اپنے بچوں پر رحم کرو۔ برے کام کا پھل کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ نہیں تو پہلے مجھی کو زہر دے دو"۔

فیصلہ کے دن صبح کو ایک کنجڑن سبزی لے کر آئی۔ منشائن سے بولی
"بہو جی ہم نے بجار میں ایک بات سُنی ہے۔ بُرا نہ مانو تو کہوں۔ جس کو دیکھو
اس کے منہ میں یہی بات ہے کہ لالہ بابو نے جال ساجی سے پنڈتائن کا الا کا لے
لیا ہے۔ ہمیں تو اس پر اکبین کبھی نہیں آتا۔ لالہ بابو نے سنبھالا ہوتا۔ تو اب تک
پنڈتائن کی ایک انگل زمین نہ بچتی۔ انہیں کا ایسا جگرا تھا کہ سب کو سنبھال لیا
تو اب کیا انہیں کے ساتھ بدی کرینگے؟ ارے بہو! کوئی کچھ ساتھ لاتا ہے کہ لے
جائے گا۔ یہی نیکی بدی رہ جاتی ہے برے کا پھل برا ہی ہوتا ہے۔ آدمی نہ دیکھے
پر اللہ سب کچھ دیکھتا ہے"۔

بہو جی پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ جی چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے تو اس میں
سما جاؤں۔ عورتوں میں عزت اور حیا بہت زیادہ ہوتی ہے۔ طعن و تشنیع کی
برداشت اُن سے نہیں ہو سکتی سر جھکائے ہوئے بولی۔ "بوا میں ان باتوں کو کیا
جانوں۔ میں نے تو یہ بات آج تمہارے منہ سے سُنی ہے۔ کون کونسی ترکاری
ہے"؟

منشی ست نرائن لال بھی اپنے کمرے میں پڑے کنجڑن کی یہ باتیں سُن
رہے تھے۔ اس کے چلے جانے کے بعد وہ بیوی کے پاس آ کر پوچھنے لگے۔ "یہ
کیا کہہ رہی تھی۔؟"

بیوی نے شوہر کی طرف سے منہ پھیر کر زمین کی طرف تاکتے ہوئے کہا "
کیا تم نے نہیں سُنا؟ تمہارے کرتب کا بکھان کر رہی تھی۔ تمہاری بدولت
دیکھیں کس کس کے منہ سے یہ باتیں سُننا پڑتی ہیں۔ اور کس کس سے منہ چھپانا پڑتا ہے"؟

منشی جی اپنے کمرے میں لوٹ آئے۔ بیوی کی باتوں کا کچھ جواب نہ دیا۔ دل پر
عزت کا غلبہ ہو گیا۔ جس شخص کی نیک نیتی کی سارے شہر میں دھوم ہو۔ جو ہمیشہ
غرور سے گردن اٹھا کر چلتا رہا ہو جو ہمیشہ اعزاز و احترام کی نگاہوں سے دیکھا گیا
ہو وہ کبھی زبان خلق سے بے پرواہ نہیں ہو سکتا۔ بدنامی کا خوف ہی بدنیتی کا سب
سے بڑا دشمن ہے۔ منشی جی نے سمجھا تھا۔ میں اس فعل کو ایسے خفیہ طریق سے کر لوں
گا۔ کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔ اور میرے اعتبار میں ذرہ بھر بھی فرق نہ آئے
گا ان کی یہ آرزو تو پوری نہ ہوئی مشکلات پیدا ہو گئیں۔ ان مشکلات کے دور
کرنے میں انہیں چوری تک کرنا پڑی۔ لیکن یہ سب اسی بدنامی کے خوف سے جس
میں کوئی یہ نہ کہے۔ کہ اپنی مالکہ کو دھوکا دیا۔ باوجود اس احتیاط کے وہ رسوائی
کے تازیانے سے نہ بچ سکے۔ بازار کی سودا بیچنے والی عورتیں تک اب انہیں
ذلت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ پنجہ نفس میں دبا ہوا ایمان اس صدمہ کو
برداشت نہ کر سکا منشی جی سوچنے لگے۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ مانا کہ میں
صاحب جائداد ہو جاؤں گا۔ لیکن بدنامی میرے گلے کا ہار بنی رہے گی۔ عدالت
کا فیصلہ مجھے ذلت سے نہ بچا سکے گا۔؟

ثروت کا نتیجہ ہے عزت اور وقار۔ جب یہی نہیں تو ثروت کس کام
کی ؟ اطمینان قلب کھو کر دنیا کی آنکھوں میں ذلیل بن کر۔ بے حیائی کا
بوجھ سر پر رکھ کر اور اپنے گھر میں نفاق بو کر ثروت اور دولت میرے کس
کام آئے گی ؟ اور اگر ہو سچ مچ مجھ پر قہر الٰہی نازل ہو۔ تو میرے لئے منہ میں
کالک لگا کر گھر سے نکل جانے کے سوا اور کوئی علاج نہ ہو گا۔ نیک نیت

انسان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو لوگ اس کے ساتھ ہمدردی کرتے ہیں سیہ کاروں پر کوئی مصیبت آتی ہے۔ تو لوگ اُسے طعنے دیتے ہیں۔ اس حالت میں ایشور بے انصاف ٹھہرایا جاتا ہے۔ لیکن اس حالت میں ایشور کے انصاف کی تعریف ہوتی ہے۔ پرماتما کسی طرح مجھے اس غار سے نکالو کیوں نہ جاکر میں بھان کنور کے پیروں پر گر پڑوں اور کہوں کہ مقدمہ اٹھا لیجئے۔ ہائے افسوس! پہلے مجھے یہ بات کیوں نہ سوجھی۔ اگر کل تک میں ان کے پاس چلا گیا ہوتا۔ تو سارے کام بن جاتے۔ پر اب کیا ہو سکتا ہے۔ آج تو فیصلہ کا دن ہے۔

منشی جی بہت دیر تک انہیں خیالات میں ڈوبے رہے۔ لیکن کچھ فیصلہ نہ کر سکے کہ کیا کرنا چاہیئے۔

بھان کنور کو یقین ہو گیا۔ کہ اب گاؤں ہاتھ سے جاتا ہے بیچاری ہاتھ مل کر رہ گئی۔ رات بھر اُسے نیند نہیں آئی۔ رہ رہ کر منشی ست نرائن لال پر غصہ آتا تھا۔ ظالم، ڈھول بجا کر میرا پچاس ہزار کا مال لئے جاتا ہے۔ اور میں کچھ نہیں کر سکتی۔ آجکل کے یہ انصاف کرنے والے بالکل آنکھ کے اندھے ہیں۔ جس بات کو سارا زمانہ جانتا ہے وہاں تک بھی اُن کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی۔ بس دوسروں کی آنکھ سے دیکھتے ہیں کورے کاغذوں کے غلام! انصاف کے معنی ہیں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی۔ حق دار کو ملے۔ یہ نہیں کہ منصف صاحب خود ہی کاغذوں کے دھوکے میں آجائیں۔ اسی سے تو ایسے منتفی حیلے اور دغاباز آدمیوں

کی ہمتیں بڑھ گئی ہیں۔ لیکن خیر! گاؤں جاتا ہے تو جائے۔ تم تو کہیں شہر میں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔ :

اس خیال سے بھان کنور کو کچھ تسکین ہوئی۔ دشمن کا نقصان ہمیں اپنے فائدے سے بھی زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ یہ انسانی خاصہ ہے تم ہمارا ایک گاؤں لے گئے۔ نارائن چاہیں گے تو تمہارے ہاتھ سے بھی یہ جلدی نکلے گا۔ خود نرک کی آگ میں جلو گے اور تمہارے بعد تمہارے گھر میں کوئی نام لیوا نہ رہ جائے گا!

فیصلہ کا دن آگیا۔ آج اجلاس پر معمول سے زیادہ بھیڑ بھاڑ تھی۔ اس مقدمہ سے ہر خاص و عام کو دلچسپی تھی۔ ایسے مقطع لوگ نظر آتے تھے جو بگلوں کی طرح سرکاری تقریبوں کے چشمۂ شیریں کے کنارے ہی نظر آتے ہیں۔ مقدمہ اپنی نوعیت میں فرد تھا۔ وکیلوں۔ مختاروں کی کالی پلٹن کا ہجوم تماشائیوں سے کچھ ہی کم تھا عین مقررہ وقت پر جج صاحب اجلاس پر نمودار ہوئے۔ وسیع ہال میں سناٹا چھا گیا۔ لوگ ہمہ تن گوش و چشم ہو گئے۔ :

اہلمد نے صندوق سے تجویز نکالی۔ اشتیاق نے لوگوں کا ایک ایک قدم اور آگے کھسکا دیا۔ :

جج نے فیصلہ سنایا "مدعی کا دعویٰ خارج۔ فریقین اپنے اپنے مصارف کے ذمہ دار رہیں" ہر چند عام قیاس اس فیصلہ کی جانب مائل تھا۔ تاہم آج جج کی زبان سے سن کر سارے مجمع میں ہلچل پڑ گئی

جو اندیشہ تھا وہ واقعہ ثابت ہوا۔ مایوسانہ انداز سے سرگوشیاں کرتے ہوئے لوگ عدالت سے باہر نکلنے لگے۔

دفعتہً بھان کنور گھونگٹ نکالے اجلاس پر آکر کھڑی ہوئی۔ جانے والے لوٹ پڑے۔ جو باہر نکل گئے تھے۔ پھر لپک کر آگئے ساری جماعت دم بخود ہو کر بھان کنور کی طرف تکنے لگی۔ ایک ساحر تھا۔ جس نے اُنگلی کے اشارے سے ساری جماعت پر منتر ڈال دیا تھا۔

بھان کنور نے جج صاحب سے کانپتے ہوئے لہجہ میں کہا۔ "سرکار کا حکم ہو تو میں ست نرائن لال سے کچھ پوچھوں؟"

یہ ایک بے ضابطہ بات تھی۔ تاہم جج نے ازراہِ انسانیت اس کی اجازت دے دی۔ تب بھان کنور نے ست نرائن لال کی طرف دیکھ کر کہا۔ "لالہ جی! سرکار نے تمہاری ڈگری تو کر ہی دی گاؤں تمہیں مبارک ہے۔ مگر ایمان آدمی کا سب کچھ ہے۔ ایمان سے کہہ دو گاؤں کس کا ہے؟

یہ سوال سُن کر ہزاروں آدمی منشی جی کی طرف حیرت آمیز۔ استفسار کی نگاہوں سے تکنے لگے۔ منشی جی دریائے فکر میں ڈوبے دل میں نفس اور ایمان کے داؤ پیچ ہونے لگے ہزاروں آدمیوں کی آنکھیں ان کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ اصل واقعہ کسی سے پوشیدہ نہ تھا اتنے آدمیوں کے رُوبرو جھوٹی بات زبان سے نہ نکل سکی

غیرت نے زبان بند کردی۔ "میرا" کہہ دینے میں کام بنتا تھا کوئی امر مانع نہ تھا۔ لیکن بدترین گناہ کی جو سزا دُنیا دے سکتی ہے اس کے ملنے کا پورا خوف تھا۔ "آپ کا" کہہ دینے میں کام بگڑتا تھا۔ جیتی جتائی بازی ہاتھ سے جاتی تھی۔ لیکن بہترین فعل کے لئے دُنیا جو انعام دے سکتی ہے۔ اس کے ملنے کی امید کامل تھی۔ اس امید نے خوف کو دبا لیا انہیں ایسا معلوم ہوا۔ گویا ایشور نے اُنہیں سرخرو بننے کا یہ آخری موقع دِیا ہے۔ میں اب بھی اپنے ایمان کو بچا سکتا ہوں۔ اب بھی دُنیا کی نگاہوں میں عزت پا سکتا ہُوں انہوں نے آگے بڑھ کر بھان کنور کو سلام کیا۔ اور کانپتی ہوئی آواز سے بولے "آپ کا"! فتح حق کا ایک نعرہ بلند کمرہ میں گونجتا ہوا عالمِ بالا تک جا پہنچا۔ جج نے کھڑے ہو کر کہا "یہ قانون کا فیصلہ نہیں ایمان کا فیصلہ ہے"۔

داستان ختم ہو گئی۔ داستان نہیں امر واقعہ ہے۔ فریقین اب بھی شاید بقید حیات ہیں۔ ست نرائن لال سے جتنے ہی لوگ شاکی تھے اتنے ہی اب ان کے مداح ہو گئے۔ انسانی قانون پر خدائی قانون نے جو شاندار فتح پائی تھی۔ اس کے شہر میں مہینوں چرچے ہوتے رہے۔ بھان کنور ست نرائن لال کے گھر گئی۔ اُنہیں منا کر لائی پھر اپنا سارا کاروبار ان کے ہاتھ میں سونپا۔ اور کچھ دنوں میں وہی موضع منشی جی کے نام ہبہ کر دیا۔ منشی جی نے بھی

اسس کو اپنے تصرف میں لانا مناسب نہ سمجھا۔ کرشن ارپن کر دیا اب اس کی آمدنی محتاج اور بیکسوں اور مسکین طلبا کی امداد میں صرف ہوتی ہے۔